"میں نے اُسے باپ کہنے کی جُرأت کی"!

I dared to call Him Father

بلقیس شیخ

"میں نے اُسے باپ کہنے کی جُرأت کی"!

I dared to call Him FATHER

مترجمین
دو شاگرد

Translated by
Two Disciples

بلقیس شیخ

Published by C.L.C. Asian Books (U.K.)

"میں نے اُسے
باپ کہنے کی
جُرائت کی"!

**I dared
to call Him
FATHER**

پبلشر

این۔ دین

لندن (انگلستان)

اشاعتِ اوّل ... ۱۹۸۱ء

(جملہ حقوقِ اشاعت محفوظ ہیں)

اِس کتاب کا کوئی حِصّہ، جُملہ، باب، یا حوالہ بغیر پبلشر کی تحریری اِجازت کے شائع نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہی اِس کی فوٹو کاپی کی جا سکتی ہے خِلاف ورزی کرنے والے کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔

Original translation into Urdu by Two Disciples

© Published by arrangement with Chosen Books, U.S.A.

First Urdu edition 1980
Reprinted 1992
Published by C.L.C. Asian Books (U.K.)

Printed in Sri Lanka by New Life Literature (Pvt) Ltd.

فہرست

نمبر شمار	باب		صفحہ
1	پہلا باب	ایک خوفناک حضوری	11
2	دوسرا باب	عجیب کتاب	23
3	تیسرا باب	سپنے	32
4	چوتھا باب	مقابلہ	40
5	پانچواں باب	چور راہے	56
6	چھٹا باب	اُس کی قربت میں رہنے کا سبق	66
7	ساتواں باب	پانی اور آگ سے بپتسمہ	78
8	آٹھواں باب	کیا میں محفوظ تھی ؟	92
9	نواں باب	قطعی تعلق	108
10	دسواں باب	اُس کی حضوری میں جینے کا سبق	124
11	گیارھواں باب	بدلتے رُخ	148
12	بارھواں باب	بونے کا وقت	156
13	تیرھواں باب	دھمکیوں کا طوفان	169
14	چودھواں باب	نئی منزل	192

دیباچہ

خدائے ذوالجلال، ازلی، ابدی اور لامحدود ہیں، اُن کی صفاتِ کاملہ بھی ازلی، ابدی اور لامحدود ہیں۔ کائنات کی ہر شئے تغیّر پذیر ہے۔ مگر اِس کائنات کا خالق آج اور کل اور ابد تک یکساں رہے گا۔

خدائے قادرِ مطلق اپنی شفقت اور بے بیان فضل کو گوناگوں انداز میں اپنی اشرف المخلوقات مخلوق پر آشکارا کرتا ہے۔

معزّز مسلمان گھرانے کی خاتون "بیگم بلقیس شیخ" کی سرگذشت ربِ جلیل کے حیران کُن اور حیات افزا کرشموں کی منہ بولتی تصویر ہے۔

اپنی ابتدائی صورت میں یہ کتاب انگریزی زبان میں شائع ہوئی۔ اِس کتاب کا ترجمہ عربی، ترکی اور جرمن زبان میں شائع ہو چکا ہے۔ کئی ممالک میں اِس کی مقبولیت اور افادیت کے پیشِ نظر اِسے اُردو زبان کی زینت بنانے کی ایک ناچیز کوشش کی گئی ہے۔

بڑھتی ہوئی بے قراری کے اِس دور میں یقیناً یہ سچّی داستان کئی خزاں رسیدہ زندگیوں میں بہار کی آمد کا پیغام دے گی۔

ہر عابد کی یہ اُمنگ ہے کہ خدائے برحق کی قُربت سے آشنا ہو۔ اور ہمارا اعتقاد ہے کہ خدائے محبت کی لازوال اُلفت کا یہ شخصی تجربہ بہتوں کے لئے ابدی زندگی کے بھید کو پانے میں معاون ہو گا۔

ہم اُن حضرات کے شکر گزار ہیں جنہوں نے اِس کارِ عظیم کی تکمیل میں دلچسپی لی۔ ہماری دعا ہے کہ باری تعالیٰ اُنہیں جزا عطا فرمائے۔

مترجمین
دوشاگرد

پہلا باب

"ایک خوفناک حضوری"

میں اپنے باغیچے میں چہل قدمی کر رہی تھی کہ میرے دل میں اجنبی سی چبھن محسوس ہوئی۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ نرگس کے پھولوں کی خوشبو سے ہوا معطر تھی۔ میں حیران تھی کہ یہ کون سی شئے ہے جس سے میں اِس قدر بے قرار ہو گئی ہوں۔

میں نے رک کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ میرے گھر کے اندر سبزہ زار صحن سے کچھ فاصلے پر نوکر کھانے والے کمرے میں صفائی میں مصروف تھے۔ باہر ہر شئے پر سکوت طاری تھا۔ اپنی خواب گاہ میں سجانے کے لئے میں جونہی ایک لمبی شاخ پر شگوفے کاٹنے کے لئے جھکی، کوئی شئے تیزی سے میرے سر کے پاس سے گزری۔ میں چونک اٹھی یہ کیا تھا؟ ایک دھندسا بادل ایک نمدار سی ناپاک حضوری تھی جو پرواز کرتی ہوئی میرے پاس سے گزر گئی باغیچہ اچانک پہلے سے زیادہ تاریک دکھائی دینے لگا۔ بید کے نوحہ کناں درختوں میں سے ایک خنک ہوا اُٹھی اور میں کانپ گئی۔

میں نے خود کو ڈانٹتے ہوئے کہا! بلقیس ہوش سنبھالو۔ میرے تصورات مجھے دھوکہ دے رہے تھے۔ بہرصورت میں نے پھول اکٹھے کئے اور جلدی سے کمرے کی طرف بڑھی۔ جہاں دریچوں سے پھوٹتی ہوئی

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی ۔

روشنی میرا خیر مقدم کر رہی تھی ۔ مکان کے سفید پتھروں کی مضبوط دیوار اور دیودار کی لکڑی کے دروازے میرے محافظ تھے۔

چلتے ہوئے میں پیچھے پلٹ پلٹ کر دیکھتی جاتی تھی ۔ میں ہمیشہ مافوق الفطرت گفتگو کا مذاق اڑایا کرتی تھی ۔ کیا واقعی کسی شئے کا وجود نہیں تھا ۔ اس کے جواب میں میں نے اپنے دائیں ہاتھ پر بڑی صفائی سے غیر طبعی سی تھپکی محسوس کی ۔

میں چلا اُٹھی ! مکان کے اندر داخل ہوتے ہی میں نے اپنے پیچھے زور سے دروازہ بند کر دیا ۔ نوکر کوئی بات کئے بغیر میری طرف دوڑے کیونکہ میں بذاتِ خود ایک بھوت لگتی ہوں گی ۔ سونے سے پہلے بالآخر میں نے اپنی دونوں خادماؤں سے اِس واقعہ کا تذکرہ کرنے کی جرأت کی ۔ میں نے اپنی داستان ختم کرتے ہوئے پوچھا کیا آپ بھوت پریت کی قائل ہیں ۔ نورجہاں اور ریشم دونوں جن میں سے ایک مسلمان اور دوسری مسیحی تھی جواب دینے سے گریز کیا ۔ مگر نورجہاں جس کے ہاتھ خوف سے کانپ رہے تھے ، کہنے لگی کہ کیا میں گاؤں کے امام کو بلاؤں تاکہ وہ باغیچہ میں کچھ پوتر پانی چھڑکے ۔ لیکن میں ہوش و حواس میں تھی اور جاہل لوگوں کی قدامت پرستی سے باغی تھی ۔ علاوہ ازیں میں اس کی خبر گاؤں میں پھیلانا نہیں چاہتی تھی ۔ میں نے اس کی ہمدردی پر مسکرانے کی کوشش کی اور کسی قدر بے باکی سے کہنے لگی " میں نہیں چاہتی کہ کوئی مذہبی آدمی میرے گھر میں قدم رکھے اور آسیب کو دور کرنے کا ڈھونگ رچائے " تاہم خادمہ کے جانے کے بعد میں نے قرآن مجید اپنے ہاتھوں میں لیا ۔ اور تھوڑی دیر تلاوت کرتی رہی اور پھر اسے نیلے ریشمی غلاف میں لپیٹ کر رکھ دیا اور سو گئی ۔

اگلی صبح میں اپنے بستر سے یوں بیدار ہو رہی تھی ۔ جیسے کوئی تیراک پانی کی سطح پر آنے کی جدوجہد کر رہا ہو ۔ میرے شعور میں ایک مدھم سا سُر

گھول رہا تھا۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ میرے دریچوں کے سنہرے نقش و نگار میں سے اذان کے الفاظ مجھ تک پہنچ رہے تھے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ مسلمانوں کو نماز کے لئے دعوت دینے والی یہ آواز گزشتہ رات کے بعد بڑی بامو قع معلوم ہوئی تھی۔ یہ ایک ایسی پکار تھی جسے میں گزشتہ چھیالیس برس سے تقریباً سنتی آئی تھی۔ میں نے اس صبح کی پکار کے معنی کا تصور کیا۔

چند لمحے پیشتر واہ کے قریب پاکستان کے ایک چھوٹے گاؤں میں ایک امام مسلمانوں کو نماز کے لئے بلا رہا تھا۔ اس کے الفاظ تھے" نماز کے لئے آؤ، فلاح کے لئے آؤ۔ نماز نیند سے بہتر ہے۔ سورج طلوع ہونے کے ساتھ ساتھ یہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اذاں کی اس قدیم آواز کے ساتھ ہی گزشتہ شام کا واقعہ تازہ ہو گیا۔ معمول کے مطابق میں روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ مصروف رہنے سے ایک طرح کا دلاسہ ملتا تھا۔ اُٹھتے ہی میں نے خادمہ کو بلانے کے لئے گھنٹی بجائی اور اس کی آواز سنتے ہی نورجہاں جو میرے اٹھنے کا انتظار کر رہی تھی بھاگتی ہوئی اندر آئی۔ دونوں خادماؤں کا کمرہ میرے کمرے سے متصل تھا۔ اور یقیناً وہ میرے جاگنے سے ایک گھنٹہ پہلے جاگ چکی ہوں گی اور میری طرف سے گھنٹی کی آواز سننے کی منتظر ہوں گی۔ بستر میں صبح کی چائے لازم تھی۔ نورجہاں نے میرے سنگھار کی چیزیں سجانا شروع کر دیں۔ وہ ایک نوعمر نوجوان لڑکی تھی۔ جو بڑی فرمانبردار تھی۔ مگر قدرے سست تھی۔ جب اس کے ہاتھ سے برش گرا تو میں نے اُسے ڈانٹ دیا۔ ریشم میری دوسری خادمہ تھی۔ یہ عمر میں ذرا بڑی، خاموش طبیعت، دراز قد اور پُروقار خاتون تھی۔ وہ چائے کی بڑی ٹرے ہاتھ میں لئے کمرے میں داخل ہوئی۔ اور ٹرے کو لاکر میز پر

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

رکھ دیا۔ چائے سے کپڑا اٹھا کر اُس نے کپ میں مجھے گرما گرم چائے دی۔ میں نے کہا یقیناً میری ماں میرے اِس خیال سے دل برداشتہ ہوتی میں نے کئی بار اسے مکّہ کی طرف منہ کر کے دُعا کرتے دیکھا تھا۔ اپنی ماں کے خیال کے ساتھ ہی میں نے اپنے سنگھار میز کی طرف نگاہ کی جو صدیوں پرانا تھا اور صندل کی لکڑی کا بنا ہوا اور چاندی سے منڈھا ہوا تھا یہ میری ماں کو ان کی ماں نے ورثہ میں دیا تھا۔ اب ورثہ میں یہ میری ملکیت تھا۔ دو کپ چائے پینے کے بعد میں آگے کی طرف جُھکی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ریشم میرے دراز بالوں میں کنگھی کرے اور اِس کے ساتھ ہی نور جہاں میرے ناخن تراشنے لگی۔

کام کے ساتھ ساتھ وہ بے تکلفانہ انداز میں گاؤں کی خبروں پر تبادلۂ خیال کرنے لگیں۔ نور جہاں بات کا آغاز کرتی اور ریشم اُس پر تفکرانہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتی۔ وہ ایک لڑکے کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں جو گاؤں چھوڑ کر شہر جا رہا تھا۔ اور ایک لڑکی کے بارے میں جس کا جلد بیاہ ہونے والا تھا۔ اور پھر ایک قتل سے متعلق بات کرنے لگیں، جو نزدیک کے قصبہ میں وقوع پذیر ہوا۔ اور جہاں ریشم کی آنتی رہتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اِس خبر کے ساتھ ہی ریشم کانپ اٹھی۔ کیونکہ مقتولہ ایک مسیحی تھی۔ وہ ایک جوان لڑکی تھی جو ایک مسیحی مشنری کے گھر میں مقیم تھی۔

گاؤں کے ایک تنگ چوراہے پر کوئی اس کے بدن کو روندتا ہوا نکل گیا تھا۔ پولیس تفتیش کر رہی تھی۔ میں نے اتفاقاً پوچھا کیا لڑکی کے بارے میں کوئی خبر ملی؟ ریشم نے خاموش لہجہ میں جواب دیا نہیں بیگم صاحبہ اور اس کے ساتھ ہی اُس نے میرے بالوں کا جوڑا بنانا شروع کیا۔ میں سمجھتی تھی کہ ریشم جو بذاتِ خود ایک مسیحی تھی قتل کے بارے میں بات

کیوں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میری طرح وہ بھی جانتی تھی کہ اُس لڑکی کو کس نے قتل کیا ہے؟۔ بہرصورت لڑکی نے اسلام چھوڑ کر مسیحیت کو قبول کر لیا تھا۔ شرم کا یہ دھبہ جو خاندان پر لگ چکا تھا اس وجہ سے بھائی طیش میں آ گیا تھا اور اسلامی قانون کی پیروی کی۔ یعنی جو اسلام سے پھر جائے (مُرتد ہو جائے) تو اس کی سزا موت ہے۔ اگرچہ اسلام کا یہ فتویٰ سخت ہے۔

مگر ہمیشہ ایسے جوشیلے لوگ ہوتے رہے ہیں۔ جو انتہائی طور پر لفظی معنوں کو عمل میں لاتے ہیں۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ لڑکی کو کس نے قتل کیا ہے۔ مگر کوئی اقدام نہیں ہو گا۔ ہمیشہ یوں ہی ہوتا رہا ہے۔ ایک برس ہوا کہ ایک مسیحی جو ایک مشنری کا ملازم تھا ایک گڑھے میں مردہ حالت میں پایا گیا تھا۔ اس کا گلا کاٹ دیا گیا تھا۔ اور اس پر کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اس افسوسناک داستان کو اپنے ذہن سے نکال دیا اور اٹھنے کے لئے تیار ہو گئی۔ میری ملازمہ الماری میں سے چند ایک ریشمی ساڑھیاں میرے چناؤ کے لئے نکال لائی۔ میں نے ایک سلمیٰ ستارہ والی ساڑھی کی طرف اشارہ کیا جو مجھے پہنا دی گئی۔ وہ بڑے احترام سے میرے کمرے سے چلی گئیں۔

سورج کی کرنیں میری خواب گاہ میں اپنی رنگینیاں دکھا رہی تھیں۔ میرے سنگھار میز پر پڑی ہوئی ایک سنہری فریم کی تصویر سے سورج کی روشنی منعکس ہو رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس تصویر کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ میں غصّہ میں تھی۔ کیونکہ میں نے گزشتہ روز اس تصویر کو اٹھا کر میز پر رکھا تھا۔ ملازموں میں سے کسی نے اس کو سجا کر رکھ دیا ہو گا۔ اس کھُدے ہوئے فریم میں ایک سلجھے ہوئے جوڑے کی

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

تصویر تھی، جو لندن کے ایک شاندار ہوٹل کے کونے کی میز پر لی گئی تھی۔ اپنی مرضی کے خلاف میں نے تصویر پر دوبارہ نگاہ کی۔ میری حالت ایک ایسے شخص کی سی تھی جو ایک دکھ دینے والی حقیقت کو دیکھ رہا ہو۔ سیاہ مونچھوں اور شعلوں کی سی جلتی ہوئی آنکھوں والا یہ جوان میرا خاوند جنرل شیخ تھا۔ میں نے اپنے پاس اِس تصویر کو کیوں رکھا تھا۔ نفرت کی ایک لہر میرے اندر کود گئی۔ ایک وقت جب میں یہ محسوس کرتی تھی اُس کے بغیر جینا مشکل ہے چھ سال پیشتر جب تصویر لی گئی تھی تو اُس وقت خالد پاکستان کا وزیر داخلہ تھا اُس کے ساتھ بیٹھی ہوئی حسین خاتون بذاتِ خود تھی۔ میں ایک قدامت پسند مسلمان خاندان کی بیٹی تھی۔

میرے خاندان کے لوگ گزشتہ سات سو برس سے صوبۂ سرحد کی سرد آب و ہوا میں مقیم تھے جو کسی وقت شمال مغربی ہندوستان کہلاتا تھا۔ میں دنیا بھر کے سیاسی اور صنعتی لوگوں کی مہمان نوازی کرتی رہی تھی۔ لندن اور پیرس میں قیام کے دوران ہیروڈس Harrods اور روڈی لا پیکس Rue De La Pix میں خریداری میرا معمول تھا۔ آئینہ میں دیکھتے ہوئے میں نے تصور کیا کہ تصویر میں مسکرانے والی خاتون کا وجود اَب نہیں ہے۔ اب اس کے بدن پر بڑھاپے کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ پانچ برس ہوئے خالد کے چلے جانے کے بعد تصویر کی یہ دنیا ملیامیٹ ہو چکی تھی۔ میں لندن پیرس اور راولپنڈی کی عشرت نما زندگی کو ترک کر کے ہمالیہ کی گود میں اپنے خاندان کی جائیداد پر آ بسی تھی۔

واہ میں یہ ترکہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر مشتمل تھا۔ یہاں میں نے اپنا حسین و رنگین بچپن گزارہ تھا۔ واہ باغات سے گھرا ہوا تھا۔

یہ باغات میرے خاندان کی کئی پشتوں نے لگائے تھے۔ بڑے پتھروں سے بنا ہوا ہمارا گھر اپنے تمام میناروں کے ساتھ اس قدر قدیم لگتا تھا۔ جیسے برف سے ڈھکے ہوئے سفید کوہ پہاڑ جو مغرب میں دکھائی دیتے ہیں چونکہ میری آنٹی بھی اس گھر میں رہتی تھی۔ اس لئے علیحدگی کے لئے ایک چھوٹے گھر میں جالبسی تھی جو میرے خاندان نے ذرا باہر بنایا تھا۔

بارہ ایکڑ کے کھیت میں یہ گھر ایک موتی دکھائی دیتا تھا۔ میرے آرام کے لئے ہر سہولت اس گھر میں موجود تھی۔ میرے یہاں آنے پر یہ میری توقعات سے بھی زیادہ تھا۔ وسیع باغیچہ کافی بڑھ چکا تھا۔ یہ ایک بڑی برکت کا باعث تھا۔ کیونکہ میں نے اپنے غم کا زیادہ بوجھ اس دھرتی میں دفن کر دیا۔ کچھ کھیت بو دیئے گئے۔ اور باقی زمین قدرتی حالت میں چھوڑ دی گئی۔ دھیرے دھیرے باغیچہ لاتعداد نغمہ پرداز چشموں کے ساتھ میری دنیا بن گیا۔ حتیٰ کہ ۱۹۶۶ء تک میں ایک ایسے شخص کی طرح مشہور تھی جس نے تنہائی میں پھولوں کی گود کو آشیانہ بنا لیا ہو۔ میں نے تصویر کو ایک بار دیکھا اور اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔

میں دریچہ میں سے واہ کے گاؤں کا نظارہ کرنے لگی۔ گاؤں کے نام کے معنی ہی خوشی کا کلمہ تھا۔ صدیوں پہلے ایک مغل شہنشاہ اکبر یہاں سے اپنے قافلے کے ساتھ گزرا تھا۔ اس کا کاروان اس چشمہ کے پاس رکا تھا۔ جو آب میری قیام گاہ تھی۔ بلوط کے درخت کے نیچے آرام کرتے ہوئے اس نے کہا "واہ!" اور اس طرح اس جگہ کا نام یہ رکھ دیا گیا۔

مگر اس نظارہ کی یاد سے مجھے کوئی تسکین نہ ملی۔ گزشتہ شام کا اجنبی واقعہ ابھی تک مجھے پریشان کئے ہوئے تھا۔ تاہم کھڑکی کے نزدیک

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

کھڑے میں نے اِسے اپنے ذہن سے نکالنے کی کوشش کی۔ یہ دوسری صبح تھی۔ میں نے اپنے آپ کو بتایا کہ زندگی کا وہی معمول پھر شروع کیا جائے۔ گزشتہ واقعہ حقیقی دکھائی دیتا تھا۔ مگر اس کی حقیقت ایک بھیانک خواب کی سی تھی۔ سفید پردوں کو ہٹاتے ہوئے میں نے صبح کی تازہ ہوا کا لطف لیا۔

نوکر کے صفائی کرنے کی آواز آرہی تھی۔ صبح کی فضا میں پن چکّی کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ اِس کے علاوہ فضا میں جلتی لکڑی کی مہک تھی۔ میں نے سُکھ کا سانس لیا۔ یہ واہ تھا۔ میرا گھر بالآخر میں یہاں محفوظ تھی۔

یہ وہ جگہ تھی، جہاں شہزادہ نواب محمد حیات خان بحیثیت ایک زمیندار سات سو برس پیشتر مقیم تھا۔ ہم اِسی کی پشت میں سے تھے۔ اور تمام ہندوستان میں ہمارا خاندان واہ کے جاگیردار کی حیثیت سے مشہور تھا۔

صدیوں پہلے شہنشاہ شاہراہ سے گزرتے ہوئے ہمارے آباو اجداد سے ملاقات کو آتے تھے میرے ہوش سنبھالنے کے دنوں میں بھی یورپ اور ایشیا کے بہت سے سیاح اِیسی شاہراہ سے گزرتے تھے۔ یہ ہندوستان میں قافلوں کے لئے ایک قدیم شاہراہ تھی۔ مگر اب عام طور پر فقط میرا اپنا خاندان ہی اِس پر گامزن میرے پھاٹک کی طرف آتا تھا۔ میرا زیادہ تر وقت اب اپنے خاندان کے لوگوں کے ہمراہ ہی گزرتا تھا اور دیگر لوگوں سے ملاقات کی مجھے ضرورت بھی نہیں تھی۔ میرے چودہ ملازم میرے لئے کافی رونق فراہم کرتے تھے۔ انہوں نے پشت در پشت میرے خاندان کی خدمت کی تھی۔ میری سب سے بڑی رونق محمود تھا۔ میرا نواسا محمود چار برس کا تھا۔ اس کی ماں ٹونی میرے تین بچّوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ دُبلے جسم کی پُرکشش خاتون تھی۔ ٹونی راولپنڈی

میں ہولی فیملی ہسپتال میں ڈاکٹر تھی۔ اس کا خاوند ایک مشہور زمیندار تھا۔ ان کی ازدواجی زندگی خوشگوار نہ تھی۔ رفتہ رفتہ ان کی ازدواجی زندگی تباہی کی طرف بڑھتی رہی۔ لمبی مدت کے جھگڑوں میں وہ محمود کو میرے پاس بھیجا کرتی تھی۔ ایک روز ٹونی اور اُس کا خاوند مجھے ملنے آئے اور کہنے لگے کہ کیا ایک برس کے لئے محمود میرے ہاں رہ سکتا ہے؟ جب تک ناچاقیاں دُور ہو جائیں۔ میں نے کہا نہیں ... میں نہیں چاہتی کہ محمود کی حیثیت ایک ٹینس بال کی سی ہو۔ مگر میں اس بات کے لئے رضامند ہوں کہ اِسے اپنے لے پالک بچے کی حیثیت سے رکھ لوں۔ افسوس کا مقام کہ ٹونی اور اس کے خاوند کی ازدواجی زندگی بہتر نہ ہو سکی۔ اور بالآخر طلاق تک نوبت پہنچ گئی۔ تاہم انہوں نے مجھے محمود کو لے پالک بیٹے کی حیثیت سے رکھنے کی اجازت دے دی یہ سب بھلا دکھائی دے رہا تھا۔ ٹونی اکثر محمود کو ملنے آتی اور ہم تینوں آپس میں بہت قریب تھے۔ خاص طور پہ اس حال کہ میرے دوسرے بچے مجھ سے کافی فاصلے پر تھے۔ محمود کو میرے ہاں رہتے ہوئے تین برس کا عرصہ ہو چکا تھا۔ یہ خوبصورت پرکشش بھوری آنکھوں والا بچہ میری خوشیوں کا مرکز تھا۔ اس کی بچگانہ ہنسی اِس تنہائی کی زندگی کو رنگین بنا دیتی تھی۔ مجھے فکر لاحق تھی کہ مجھ جیسی شخصیت کا اِس بچہ کی زندگی پر کیا اثر ہوگا۔ میں اِس بات کا خیال رکھتی کہ اُس کی ہر خواہش پوری ہو۔ تین نوکر اِس کی دیکھ بھال کے لئے مخصوص تھے۔ یہ سارا وقت اِس کی خدمت میں لگے رہتے تھے۔ کئی دن سے محمود کچھ کھا نہیں رہا تھا اِس لئے میں قدرے فکرمند تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ محمود اکثر باورچی خانہ میں جا کر نوکروں کو بہلا پھسلا کر اُن سے بسکٹ وغیرہ کھا لیا کرتا تھا۔ محمود کو پیار سے گلے لگاتے ہوئے میں نے اِس کے نوکروں سے دریافت کیا کہ اِس نے کچھ کھایا ہے؟ نہیں بیگم صاحبہ نوکرانی نے

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

آہستہ سے کہا۔ جب میں نے محمود کو کھانے کے لئے مجبور کیا تو اُس نے جواب دیا کہ مجھے بھوک نہیں۔ میں بہت بے چین تھی جب نور جہاں میرے پاس اکیلے میں آئی اور جھجکتے ہوئے بولی کہ محمود پر آسیب کا سایہ ہے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

میں نے اس کی طرف تیکھی نگاہوں سے دیکھا اور مجھے گزشتہ واقعہ یاد آگیا۔ آخر یہ سب کیا ہے۔ ایک بار اور میں نے محمود کو کھانے کے لئے مجبور کیا۔ مگر بے کار۔ وہ اپنے دل پسند سوئٹز چاکلیٹ بھی نہیں کھاتا تھا جو میں نے خاص طور پر اس کے لئے درآمد کئے تھے۔ جب میں نے چاکلیٹ کا پیکٹ پیش کیا تو اس نے مغموم نگاہوں سے مجھے تکتے ہوئے کہا کہ میں کھانا تو پسند کرتا ہوں مگر جب میں نگلنے کی کوشش کرتا ہوں تو مجھے درد محسوس ہوتا ہے۔ خوف کی ایک لہر میرے اندر دوڑ گئی کہ ایک وقت یہ بچہ اس قدر چنچل تھا اور اب اس قدر سست۔ میں نے فوراً اپنے ڈرائیور منظور کو بلایا اور اُسے کار نکالنے کا حکم دیا۔

گھنٹہ بھر میں ہم راولپنڈی میں محمود کے ڈاکٹر کے پاس تھے۔ ڈاکٹر نے محمود کا اچھی طرح معائنہ کیا اور رپورٹ دی کہ اسے کوئی تکلیف نہیں گو واپس آتے وقت محمود کو اس قدر خاموش دیکھ کر میں پریشان تھی۔ مجھے نور جہاں کی بات میں حقیقت دکھائی دینے لگی۔

کیا یہ کوئی مافوق الفطرت بات تھی کیا واقعی اُس پر آسیب کا اثر ہو گیا تھا؟ میں نے بڑھ کر اُسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ میں اس قسم کے خیالات سے اپنے آپ پر مسکرائی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار میرے باپ نے ایک دقیانوسی مسلمان پیر کے بارے میں بتایا جو معجزات کرتا تھا۔ میں اُس پر زور سے ہنسی تھی۔ میرا باپ اس سے ناخوش ہوا۔ اس طرح کی حکایات کے بارے میں خیالات آج بھی وہی تھے۔

جونہی کار ہمارے گھر کی طرف مڑی تو مجھے خیال آیا کہ کیا محمود کا معاملہ باغیچہ میں اس دھندلے بادل سے تو نہیں ہے؟ جب میں نے اپنے خوف کا ذکر نورجہاں سے کیا تو اس نے بڑی پریشانی میں مجھ سے گزارش کی کہ کیا میں گاؤں کے امام کو بلاؤں تاکہ وہ محمود کے لئے دُعا کرے اور باغیچہ میں متبرک پانی چھڑکے۔ میں نے اس کی درخواست پر غور کیا۔ میں بنیادی اسلامی تعلیم کو مانتی تھی مگر نماز اور روزہ کی کوئی زیادہ پابند نہیں تھی۔ محمود سے میرا لگاؤ میرے شکوک پر غالب آگیا۔ اور میں نے نورجہاں سے کہا کہ وہ گاؤں کی مسجد سے امام کو بلا لائے۔

دوسری صبح میں اور محمود اپنی کھڑکی کے قریب بیٹھے بے تابی سے امام صاحب کا انتظار کر رہے تھے۔ آخر کار میں نے اُسے برآمدہ کی سیڑھیوں پر سے آتے ہوئے دیکھا۔ نورجہاں اس شخص کو میرے کمرے میں چھوڑ کر خود چلی گئی۔ محمود نے اجنبی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

قرآن مجید کو کھولتے ہوئے اور محمود کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے وہ اپنے انداز میں قُل دہرانے لگا۔ امام صاحب نے تلاوت شروع کردی۔ مولوی صاحب نے مجھے بھی قرآن شریف پڑھنے کی ہدایت کی۔ اس نے سورۂ فلق اور سورۂ ناس کی طرف اشارہ کیا جو مصیبت کے وقت دہرائی جاتی ہیں۔ کہنے لگے کہ آپ بھی ان آیات کو دہرائیں۔ اب میں نے متقی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا کہ خدا مجھے بھول چکا ہے اور میں خدا کو بھول چکی ہوں مگر بزرگ آدمی کے چہرے کو دیکھتے ہوئے میرا لہجہ نرم ہوگیا۔ آخر وہ میرے کہنے پر محمود کی بھلائی کے لئے آیا تھا۔ میں نے قرآن مجید کو ہاتھ میں لیتے ہوئے تلاوت کے لئے کھولا۔ میرے سامنے یہ آیت تھی۔ محمدؐ اللہ کے پیغمبر ہیں اور جو ان کے ساتھ ہیں۔ وہ کافروں کے حق میں سخت ہیں۔

(سورۃ الفتح آیت ۲۹)

میں اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

اِس کے ساتھ ہی تمام گزشتہ واقعات میرے تصوّرات کی دنیا میں گردش کرنے لگے۔ مجھے خیال گزرا کہ کیا اِن تمام واقعات کا میری اور محمود کی زندگی سے کوئی حقیقی تعلق ہے۔ میں خوف سے کانپ گئی۔ مگر مولوی صاحب پُرسکون تھے۔

میری مصروفیات کے باوجود وہ تین روز تک محمود پر دم کرنے کے لئے آتا رہا۔ کچھ اور اجنبی واقعات کے بعد خود بخود محمود کی صحت قدرے سنبھل گئی۔ ان تمام واقعات میں کیا راز تھا اِس کی حقیقت جلد ہی مجھ پر کھلنے والی تھی۔ کیونکہ میرے جانے بغیر ایسے واقعات حرکت میں آ چکے تھے جو ماضی کو درہم برہم کرنے والے تھے۔

دوسرا باب

عجیب کتاب

اِن تجربات کے بعد میرا لگاؤ قرآن مجید کی طرف ہوا۔ ہو سکتا ہے اِن میں اِن کی تعبیر ہو اور اِس کے ساتھ میرے بالمنی خلا کو پُر کر کے یقیناً قرآن کے عربی حروف میں میرے خاندان کے لئے گویا اُن کے سوالات کا جواب تھا۔

بلاشبہ میں نے قرآن مجید پہلے پڑھا ہوا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں چار برس چار ماہ چار دن کی تھی جب میں نے تلاوتِ قرآن سیکھنا شروع کیا تھا۔ اُس موقع پر بڑی ضیافت دی گئی جس میں میرے تمام رشتہ دار شریک تھے۔ اِس کے بعد گاؤں کے امام کی بیوی نے مجھے عربی حروف ابجد سکھانا شروع کئے۔ خاص طور پر مجھے چچا فتح یاد ہیں۔ ہم انہیں بڑے چچا کہہ کر پکارتے تھے۔ میرے وہ حقیقی چچا نہیں تھے۔ مگر خاندان سے قریبی تعلقات کے سبب سے ہم انہیں چچا کہتے تھے مجھے ٹھیک طور پر یاد ہے کہ جب مجھے یہ کہانی پڑھ کر سنائی گئی کہ کیونکر جبرائیل فرشتہ حضرت محمدؐ کے پاس آئے اور ۶۱۰ء میں انہیں قرآن کی تعلیم دی۔ پہلی بار اِس مقدس کتاب کو پڑھنے میں مجھے سات سال لگے مگر جب

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

میں نے قرآن مجید ختم کیا تو ایک اور خاندانی ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔ اس سے پہلے میں نے قرآن ایک فرض سمجھ کر پڑھا تھا۔ مگر اس دفعہ میں نے فیصلہ کیا کہ میں غور سے اِس کی معنی کے ساتھ تلاوت کروں گی۔ قرآن مجید کی وہ جلد جو میری ماں نے مجھے دی تھی میں نے اس کا مطالعہ شروع کر دیا میں نے اِسے پہلی آیت سے شروع کیا۔ میں نے وہ پہلا پیغام پڑھا جو حضرت محمدؐ کو غارِ حرا میں ملا تھا۔ جب وہ غارِ حرا میں اکیلے بیٹھے تھے :

" (اے محمدؐ) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے پیدا کیا۔ جس نے اِنسان کو خون کی پھٹکی سے پیدا کیا۔ پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم۔
جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔" (سورۃ علق ۱-۴)

اوّلیں میں الفاظ کی خوبصورتی میں کھو گئی۔ مگر بعد میں کچھ الفاظ تھے جو میرے لئے کسی تسلّی کا باعث نہ تھے۔

پھر جب وہ اپنی میعاد کے قریب پہنچ جائیں تو یا تو اِن کو اچھی طرح سے رہنے دو یا اچھی طرح سے علیٰحدہ کر دو۔
(سورۃ الطلاق۔ آیت ۲)

میرے خاوند کی آنکھوں میں فولاد کی سی سختی تھی۔ جب اُس نے مجھے بتایا کہ اُسے مجھ سے اب کوئی محبت نہیں۔! جب اِس نے یہ الفاظ کہے تو میں اپنے باطن میں کانپ گئی۔ وہ سال جو ہم نے اکٹھے بسر کئے تھے ان کا کیا ہوا؟ کیا ان کو اِس طرح مٹایا جا سکتا ہے۔ کیا قرآن کے مطابق میں میعاد کے قریب پہنچ چکی تھی۔

اگلی صبح میں نے پھر قرآن ہاتھ میں لیا۔ مجھے اُمید تھی کہ مجھے

کوئی وہ دلاسہ ملے گا، جس کی مجھے اشد ضرورت ہے، جس سکون کی مجھے تلاش تھی۔ وہ تو نہ ملا۔ مگر میں نے یہ ضرور دیکھا کہ زندہ کیسے رہنا ہے اور دوسرے عقائد سے کیونکر خبردار رہنا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آیات تھیں جن کے پیغام کو قرآن کے مطابق پہلے مسیحیوں نے غلط انداز میں پیش کیا ہے۔ اگرچہ عیسیٰ علیہ السلام کنواری سے پیدا ہوئے۔ لیکن وہ خدا کے بیٹے نہیں تھے۔ لہٰذا قرآن نے مسیحی عقیدہ "تثلیث" سے خبردار کرتے ہوئے کہا کہ تین مت کہو۔ تمہارے لئے اچھا ہے کہ اس سے باز آؤ کیونکہ اللہ ایک ہے۔ کئی روز قرآن کے مطالعہ میں لگے رہنے کے بعد ایک دوپہر میں نے اسے ایک طرف رکھ کر میں ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے اٹھی۔ اور اپنے باغیچہ کی طرف چل دی۔ مجھے اُمید تھی کہ خطرات اور پرانی یادیں مجھے کچھ سکون فراہم کریں گی۔ فطرت حسین منظر پیش کر رہی تھی اور سبزہ زار اپنے جوبن پر تھا اور پھول مسکرا رہے تھے۔ دن کافی گرم تھا۔ محمود اس راستہ پر چل رہا تھا جہاں میں اپنے بچپن میں اپنے باپ کے ساتھ چہل قدمی کیا کرتی تھی۔ میرے تصور میں یہ تصویر تھی کہ وہ میرے ساتھ چل رہے ہیں۔ حکومت کے وزیر کے شایانِ شان وہ برطانوی شرفاء کے لباس میں ملبوس رہتے تھے۔ اکثر وہ مجھے میرے پورے نام سے پکارتے تھے "بلقیس سلطانہ"۔ مجھے یہ نام سننے سے مسرت ہوتی تھی۔ کیونکہ بلقیس شیبا کی ملکہ کا پہلا نام تھا اور ہر ایک جانتا تھا کہ سُلطانہ کا مفہوم شاہی ہے۔ اور ہم دیر تک باتوں میں لگے رہتے تھے آخری برسوں میں ہم اپنے نئے ملک پاکستان کے بارے میں گفتگو سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ انہیں اس پر بڑا ناز تھا۔ پاکستان کی اسلامی سلطنت خاص طور پر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لئے معرضِ وجود میں

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

آئی تھی وہ کہتے تھے کہ ہم دنیا میں سب سے بڑی اسلامی سلطنت ہیں جس میں اسلامی قانون ہے۔ وہ مزید کہتے کہ ۹۶ فیصد آبادی مسلمانوں کی ہے۔ باقی مسیحیوں، بدھ مت اور ہندوؤں کے بکھرے ہوئے گروہ ہیں۔

لیونڈر کے پھولوں سے لدی ہوئی پہاڑیوں کو میں نے اپنے باغیچے سے دیکھا۔ میں اکثر اپنے باپ کی موجودگی میں پُرسکون رہتی تھی اُن کے آخری ایام میں تو گویا میں اُن کی ساتھی بن چکی تھی۔ میں اکثر اپنے ملک کی تیزی سے بدلتی ہوئی سیاست پر بات چیت کرتی اور اپنے خیالات ظاہر کرتی وہ بہت نرم مزاج اور سمجھدار شخصیت تھے۔ مگر اب وہ رحلت فرما چکے تھے۔ مجھے ان کی کھلی قبر کے سامنے کھڑے ہونا یاد ہے جو لندن سے باہر بُروک ووڈ Brook Wood میں مسلمانوں کے قبرستان میں ہے۔ وہ لندن میں آپریشن کے لئے آئے تھے۔ مگر صحت یاب نہ ہوئے۔ اسلامی دستور کے مطابق لاش چوبیس گھنٹے کے اندر اندر سپُردِ خاک ہو جانی چاہیئے۔ میرے قبر پر پہنچنے پر وہ لاش کو قبر میں رکھنے ہی والے تھے میرے لئے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ میں پھر اپنے باپ کو نہ دیکھ سکوں گی۔ انہوں نے تابوت کا ڈھکنا کھولا۔ اور میں نے اپنے باپ کا آخری دیدار کیا۔ مگر اب یہ سرد سفید لاش میرے باپ کی نہیں لگتی تھی۔ وہ کہاں جا بسا تھا۔ میں بُت بنی کھڑی تھی تابوت کا ڈھکنا دوبارہ اوپر رکھ دیا گیا۔ تابوت میں جانے والا ہر کیل گویا میرے بدن میں پیوست ہو رہا تھا۔ سات برس بعد میری ماں بھی چل بسی۔

پرچھائیں ڈھل چکے تھے اور میں پھر شام کے دھندلے میں کھڑی تھی۔ پُرانی یادیں سُکھ کی بجائے مجھے دُکھ دے رہی تھیں۔ دور مؤذن

شام کی نماز کے لئے لوگوں کو بُلا رہا تھا۔ اُس آواز سے میرے اکیلے پن میں اور اضافہ ہوگیا۔ دعائیہ انداز میں میں نے کہا "اے اللہ کہاں ہے وہ سُکھ و چین جس کا تو نے وعدہ کیا ہے؟"

خواب گاہ میں آکر اسی شام پھر میں نے قرآن مجید اٹھایا۔ جوں ہی میں نے مطالعہ شروع کیا، میں یہودیوں اور مسیحیوں کی کتابوں کے حوالہ جات سے متاثر ہوئی جو اس سے پہلے اتری تھیں۔ مجھے اِن کتابوں میں اپنی تلاش جاری رکھنے کا گمان ہوا۔

مگر اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں بائیبل پڑھوں۔ بائیبل کیونکر مدد دے سکتی ہے۔ جبکہ ابتدائی مسیحیوں نے اسے بدل کر پیش کیا ہے مگر بائیبل پڑھنے کا خیال زور پکڑتا گیا۔ بائیبل میں خدا کا تصوّر کیا ہے۔ یہ حضرت مسیح کے بارے میں کیا کہتی ہے۔ شاید مجھے اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ بائیبل کہاں سے لوں۔ ہمارے علاقے میں کسی دکان پر بائیبل میسّر نہیں تھی۔ شاید ریشم کے پاس بائیبل ہو۔ مگر میں نے اس خیال کو ترک کر دیا۔ اگرچہ اُس کے پاس ہو تو بھی میری درخواست سے وہ ہراساں ہو جائے گی۔ پاکستانیوں کو محض کسی مسلمان کو مسیحی بنانے کی بنا پر قتل کیا گیا تھا۔ میں نے اپنے دوسرے مسیحی نوکروں کے بارے میں سوچا۔ میرے خاندان نے مجھے خبردار کیا تھا کہ میں کسی مسیحی کو اپنا ملازم نہ رکھوں کیونکہ ان پر بھروسہ کرنا محال ہے۔ مجھے اِس کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ کیونکہ جب تک وہ اپنے فرائض کو نبھاتے تھے مجھے تسلّی تھی۔ بلاشبہ وہ بہت مخلص نہ تھے۔

جب بیرونی مشنری برصغیر ہند و پاک میں آئے، نیچی ذات کے

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

لوگوں کو مسیحی بنانا آسان تھا۔ لہٰذا بیشتر لوگ جنہوں نے مسیحیت کو قبول کیا وہ ان ہی لوگوں میں سے تھے۔ مسلمانوں میں ان کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی۔ کیا اِن کے اِس مذہب کو قبول کرنے کا سبب وہ سہولتیں نہیں تھیں جو مشنریوں نے انہیں فراہم کیں جن میں روٹی کپڑا اور تعلیم شامل تھی۔ خود ہماری نگاہ میں مشنری مضحکہ خیز تھے۔ وہ اُن غریب لوگوں میں بڑے المناک سے معروف رہتے تھے۔ کچھ روز ہوئے میرے ڈرائیور منظور نے مجھ سے ایک مشنری کو میرا باغیچہ دکھانے کی اجازت مانگی۔ کہنے لگا کہ اُنہوں نے باہر سے میرا باغیچہ دیکھ کر اسے بہت سراہا ہے۔ میں نے اجازت دے دی مجھے خیال گزرا کہ بیچارہ منظور انہیں اِس طرح متاثر کرنا چاہتا ہے۔

چند روز بعد میں اپنی کھڑکی میں سے نوجوان امریکن جوڑے کو منظور کے ساتھ اپنے باغیچہ میں ٹہلتے دیکھا۔ منظور نے اُن کا تعارف پادری مچل اور مسز مچل کے نام سے کروایا۔ دونوں مغربی لباس میں ملبوس تھے۔ اور ان کے بال سُنہرے تھے۔ میں نے سوچا کہ کس قدر بے رنگ سے یہ لوگ ہیں۔

تاہم میں نے مالی سے کہدیا کہ اگر وہ چاہیں تو انہیں بیج دے دینا مگر ان کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا بائیبل حاصل کرنے کا جواب مل گیا۔ میں کل منظور کو بائیبل میسّر کرنے کا کام سپرد کروں گی۔ لہٰذا میں نے اگلی صبح اُسے بلا بھیجا۔ وہ اپنے سفید کپڑوں میں لاچاری کی حالت میں میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس سے میں پریشان تھی۔ میں نے کہا منظور مجھے ایک بائیبل چاہیئے۔ منظور پریشانی کے عالم میں بولا "بائیبل" بڑے صبر کو خاطر میں لاتے ہوئے میں نے کہا "بلاشبہ بائیبل" چونکہ منظور

اَن پڑھ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے پاس بائیبل نہیں ہوگی۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے مہیا کر سکتا ہے۔ دلی زبان میں اُس نے کچھ کہا۔ جو میں نہ سمجھ سکی۔ میں نے اسے حکم کے طور پر بائیبل مہیا کرنے کو کہا۔ بڑے احترام سے وہ میرے پاس سے چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری مانگ کو پورا کرنے سے کیوں اعتراض کر رہا تھا۔ منظور کی طبیعت ریشم کی سی تھی۔ دو دونوں اس لڑکی کے قتل کی وجہ سے ہراساں تھے وہ اِس خوف کا شکار تھے کہ اونچے گھرانے کے مسلمانوں کو بائیبل دینا اُن کو مصیبت میں ڈال سکتا ہے۔

دو روز بعد منظور ٹونی سے ملاقات کی خاطر مجھے راولپنڈی لے جا رہا تھا۔ منظور! ابھی تک بائیبل نہیں ملی؟ میں اسٹیئرنگ پر اُس کا رنگ پیلا پڑتا دیکھ رہی تھی۔ بیگم صاحبہ! میں آپ کو لا دوں گا۔ تین روز بعد میں نے اُسے بلوا بھیجا اور کہا منظور تین بار میں نے تم سے بائیبل لانے کے لئے کہا ہے مگر تم نہیں لائے۔ میں تمہیں ایک دن اور دیتی ہوں اگر بائیبل نہ آئی تو تم ملازمت سے برخاست۔ اُس کے ہاتھوں سے طوطے اُڑ گئے۔ وہ جانتا تھا کہ جو میں کہہ دیتی تھی وہی کرتی تھی۔ وہ بوجھل قدموں کے ساتھ میرے پاس سے رخصت ہو گیا۔ دوسرے روز ٹونی کے آنے سے پیشتر ایک چھوٹی بائیبل پُراسرار طور پر میرے ڈرائینگ روم کی میز پر پڑی تھی۔ میں نے اُسے اُٹھا کر غور سے اُس کا مشاہدہ کیا۔ یہ ایک سادہ سے مٹیلے رنگ میں مجلد اردو کی بائیبل تھی ایک سو اسّی برس پیشتر ایک انگریز نے اُس کا ترجمہ کیا تھا۔ اور میرے لئے فرسودہ قسم کے فقرات کو سمجھنا مشکل تھا۔ یقیناً منظور نے کسی دوست سے لی ہوگی۔ یہ تقریباً نئی تھی۔ میں نے اِس کی ورق گردانی

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

کرنے کے بعد اسے رکھ دیا اور بھول گئی۔

کچھ عرصے کے بعد ٹونی آ پہنچی۔ محمود چلاتا ہوا اس کی طرف بھاگا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس کی ماں اس کے لئے کھلونے لائی ہوگی۔ محمود اپنا کھلونا لے کر باہر چلا گیا۔ ہم دونوں چائے پینے لگیں۔ اسی وقت ٹونی کی نظر میرے پاس میز پر رکھی ہوئی بائیبل پر پڑ گئی۔ وہ کہنے لگی اوہ بائیبل اسے کھول کر دیکھو یہ کیا کہتی ہے۔ ہمارے خاندان میں ہر مذہب کی کتاب کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ کسی مقدس کتاب کو فال کے طور پر کھولنا ایک عام معمول تھا اور یہ دیکھنا کہ آنکھیں بند کر کے جس حصّہ پر ہاتھ رکھیں اس میں کیا نبوت ہے۔ بائیبل کو کھولا اور اس کے الفاظ کو دیکھنے لگی۔ پھر ایک پُراسرار واقعہ پیش آیا۔ میری توجہ دائیں ہاتھ کے صفحہ کے کونے پر پڑی اور میں اُسے پڑھنے کے لئے جُھکی۔

"جو میری امّت نہ تھی اُسے اپنی اُمّت کہونگا اور جو پیاری نہ تھی اُسے پیاری کہوں گا اور ایسا ہوگا کہ جس جگہ اِن سے کہا گیا تھا کہ تم میری اُمّت نہیں ہو اسی جگہ وہ زندہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔" (رومیوں ۹ باب ۲۵، ۲۶)

میرے بدن میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی میں نے سانس روک لیا۔ مجھے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ آیت مجھے اس قدر متاثر کیوں کر رہی ہے جو میری اُمّت نہ تھی اُسے اُمّت کہوں گا ... جس جگہ ان سے کہا گیا تھا کہ تم میری اُمّت نہیں ہو اُسی جگہ وہ زندہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔ کمرے میں سکوت طاری تھا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر ٹونی کی طرف دیکھا ٹونی کچھ سُننے کی منتظر تھی کہ میں نے کیا ڈھونڈا ہے۔ مگر میں اونچی

آواز میں آیت پڑھنے سے قاصر تھی۔ اُس میں میرے لئے اِس قدر گہرائی تھی کہ محض لطف کے لئے اُنہیں پڑھنا میرے لئے محال تھا۔ لڑکی کی اٹھی ہوئی نگاہیں مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ امیّ کیا ہے؟ میں نے کتاب بند کردی اور دبی زبان میں بولی کہ اب یہ کھیل نہیں رہا۔ اِس کے ساتھ ہی میں نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ دہکتی ہوئی آگ کی طرح الفاظ میرے اندر بھڑک رہے تھے۔ اور اِن کا انجام اُن غیر معمولی خرابیوں کی تیاری تھا جو میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں۔

تیسرا باب

"سپنے"

دوسرے روز میں نے پھر بائیبل اُٹھائی۔ گفتگو کا موضوع بدلنے کے بعد نہ لوئی نے اور نہ ہی میں نے بائیبل سے متعلق کوئی بات کی۔ مگر طویل عرصہ تک اُس حوالہ کے الفاظ میرے تحت الشعور میں موجزن رہے۔ دوسرے روز علی الصبح میں تسلّی سے بائیبل کا مطالعہ کرنے کی خاطر اپنی خوابگاہ میں گئی۔ میں نے بائیبل لی۔ اور اپنے دیوان کے سفید تکیوں کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ ورق گردانی کرتے ہوئے ایک اور پریشان کن حوالہ میرے سامنے تھا۔

"مگر اسرائیل جو راستبازی کی شریعت کی تلاش کرتا ہے اِس شریعت تک نہ پہنچا۔" (رومیوں ۹ : ۳۱)

میں نے سوچا آہ! بالکل جس طرح قرآن شریف نے فرمایا یہودیوں نے اپنا مقام کھو دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس حوالہ جات کا مصنف کوئی مسلمان ہو۔ یہ خیال مجھے اس لئے اچھا گذرا کیونکہ مصنف کہہ رہا تھا کہ انہوں نے خدا کی راستبازی کو نہ جانا۔

مگر دوسرے حوالے کو پڑھ کر میں نے دم سادھ لیا۔ "کیونکہ ہر ایک ایمان لانے والے کی راستبازی کے لئے مسیح شریعت کا انجام ہے"۔ لمحہ بعد کے لئے میں نے نگاہ کتاب سے ہٹالی۔ مسیح ؟ "شریعت کا انجام ہے"۔ میں نے دوبارہ پڑھنا شروع کیا "یہ کہ کلام تیرے نزدیک ہے بلکہ تیرے منہ اور تیرے دل میں ہے۔ یہ وہی ایمان کا کلام ہے جس کی ہم منادی کرتے ہیں کہ اگر تو اپنی زبان سے یسوع کے خداوند ہونے کا اقرار کرے اور اپنے دل سے ایمان لائے کہ خدا نے اُسے مُردوں میں سے جلایا تو نجات پائیگا (رومیوں ۱۰ : ۸،۹) میں نے یعنی مَیں اپنا سر ہلاتے ہوئے کتاب نیچے رکھ دی۔ یہ بلا واسطہ قرآن کا تضاد تھا۔ مسلمان کا یقین ہے کہ حضرت مسیح محض انسان تھے اور یہ انسان صلیب پر نہیں مرے تھے بلکہ خدا نے انہیں زندہ آسمان پر اُٹھا لیا تھا۔ اور اُن کی تشبیہہ کا کوئی آدمی صلیب پر چڑھا دیا گیا تھا۔ اور اب وہ ایک نیچے درجے کے آسمان میں مقیم ہیں ۔ یہی مسیح کسی دن دُنیا پر چالیس برس حکومت کرنے آئیں گے۔

درحقیقت میں نے سُنا ہے کہ مدینہ میں ان کے لئے ایک جگہ موجود ہے۔ اُس شہر میں جہاں حضرت محمدؐ مدفون ہیں۔ قیامت کے روز یسوع زندہ ہوں گے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ خدا کے تختِ عدالت کے روبرو کھڑے ہوں گے۔ مگر بائیبل کا بیان ہے کہ مسیح مُردوں میں سے جی اُٹھا ہے یا تو یہ کُفر ہے۔ اور یا ... میرا ذہن چکرا گیا۔ میں جانتی تھی کہ جو اللہ کا نام لے گا وہ بچایا جائے گا۔ مگر یہ ماننا کہ یسوع اللہ ہے میرے لئے ایک مسئلہ تھا۔ حضرت محمدؐ بھی جو کہ

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

نبی آخر الزماں اور سب سے بڑے پیغمبر تھے۔ محض فانی تھے۔ میں بستر میں لیٹ گئی۔ میرے ہاتھ میری آنکھوں پر تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر بائیبل اور قرآن ایک ہی خدا کی بشارت دیتے ہیں تو ان میں اِس قدر الجھن اور تضاد کیوں ہے ؟

معلوم نہیں میں کب سوگئی۔ مجھے سپنے نہیں آتے۔ مگر اس شب میں نے خواب دیکھا۔ خواب زندگی کی مانند تھا اور واقعات اِس قدر حقیقی تھے کہ میرے لئے یہ ماننا محال تھا کہ یہ محض ایک وہم تھا کیا دیکھتی ہوں کہ میں ایک آدمی کے ساتھ کھانا کھا رہی ہوں۔ جو کہ مجھے معلوم تھا کہ یسوع ہے۔ وہ میرے گھر میں مجھ سے ملاقات کو آیا تھا، اور دو روز تک رہا۔ میز کی دوسری طرف وہ میرے روبرو بیٹھے تھے اور اطمینان اور خوشی سے ہم نے کھانا کھایا اچانک سپنا تبدیل ہوگیا۔ اب میں پہاڑ کی چوٹی پر ایک اور شخص کے ہمراہ تھی۔ وہ ایک چُغے میں ملبوس تھا اور سینڈل پہنے ہوئے تھا۔

یہ کیونکر ممکن تھا کہ پُرا سرار طور پر میں اُس کے نام سے بھی واقف تھی "یوحنا بپتسمہ دینے والا"۔ کیسا اجنبی سا نام تھا۔ میں یوحنا کو یسوع سے اپنی ملاقات کے بارے میں بتا رہی تھی۔ میں نے کہا کہ "خداوند آیا اور دو روز تک میرا مہمان رہا۔ مگر اب وہ جا چکا ہے۔ وہ کہاں ہے۔ ضرور ہے کہ میں اس کو تلاش کروں۔ یوحنا اصطباغی شاید آپ مجھے اُن کا پتہ بتا سکیں۔ یہ خواب تھا۔ جاگنے پر میں اونچی آواز میں یہ نام پکار رہی تھی "یوحنا اصطباغی، یوحنا اصطباغی"۔ نور جہاں اور

ریشم دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ میرے چلّانے کے سبب وہ کچھ شرمسار سی ہو گئیں اور لیوں ظاہر کرنے لگیں کہ وہ میرے غسل کے لئے تیاری کر رہی ہیں۔ جونہی وہ اپنے کام میں مصروف ہوئیں میں نے انہیں اپنا خواب بتانے کی کوشش کی۔ نور جہاں نے ہنستے ہوئے مجھے عطر کی طشتری پیش کی۔

میرے بال بناتے ہوئے وہ یے الفاظ میں ریشم کہنے لگی یقیناً یہ مُبارک سپنا تھا۔ میں حیران تھی کہ باوجود مسیحی ہونے کے ریشم نے کسی قسم کی خوشی کا اظہار نہ کیا۔ میں نے اُس سے یوحنا اصطباغی کے بارے میں پوچھا پھر خود ہی سوچا کہ ریشم ایک سادہ دیہاتی عورت بھلا کیا جانے کہ یوحنا اصطباغی تھا کون۔ جہاں تک میں نے بائیبل کا مطالعہ کیا تھا میں اس نام سے ناواقف تھی۔

اگلے تین روز میں نے قرآن مجید اور بائیبل کا مطالعہ مسلسل جاری رکھا۔ کبھی ایک کو پڑھتی اور کبھی دوسری کو۔ قرآن کا مطالعہ تو میرے لئے ایک فرض تھا۔ اور پھر اس کے ساتھ ساتھ میں مسیحیوں کی اس نئی کتاب گویا غوطے مار کر اپنی الجھا دینے والی اُس دنیا کا سُراغ ڈھونڈ رہی تھی جو میں نے پائی تھی۔ ہر بار بائیبل کھولنے پر احساسِ جُرم مجھ پر طاری ہو جاتا۔ شاید یہ احساسِ جرم میری سخت تربیت کے سبب سے تھا۔

میرے بالغ ہونے پر بھی میرا باپ میرے مطالعہ کی کتابوں کی چھان بین کرتا تھا۔ ایک دفعہ میرا بھائی اور میں چوری چھپے ایک کتاب کمرے میں لے آئے تھے۔ اگرچہ یہ کتاب بُری نہیں تھی تو بھی اُس کو پڑھتے وقت ہم کافی خوفزدہ تھے۔ اب جب میں بائیبل کھولتی ہوں تو میں

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

اُسی خوف کو محسوس کرتی تھی۔

ایک کہانی میری توجہ کا مرکز تھی۔ یہ یہودی رہنماؤں سے متعلق تھی جو ایک عورت کو حضرت مسیح کے پاس لائے جو زناکاری کے گناہ میں پکڑی گئی تھی۔ میں اُس عورت کے انجام سے کانپ گئی۔ قدیم مشرقی اخلاقی قوانین ہمارے پاکستانی اخلاقی قوانین سے کچھ مختلف نہ تھے۔ معاشرے کے لوگ زناکار عورت کو سزا دینے کے پابند تھے۔ جونہی میں نے بائیبل میں اُس مجرم عورت کے بارے میں پڑھا جو اپنے فتویٰ لگانے والوں کے روبرو کھڑی تھی تو میں جانتی تھی کہ پہلی صف میں اُس کے اپنے رشتہ دار اُسے سنگسار کرنے کے لئے کھڑے تھے۔ پھر نبی نے کہا "تم میں سے جو بے گناہ ہو وہ اِسے پہلے پتھر مارے" (یوحنا ۸: ۷) میں نے اپنے تصوّر میں اِن آدمیوں کو دبے پاؤں سر جھکائے جاتے دیکھا بجائے اِس کے کہ اُسے واجبی موت کا حکم سُنایا جاتا۔ یسوع نے اُس پر الزام لگانے والوں کو اُن کا اپنا گناہ ماننے پر مجبور کر دیا۔ میں سوچ کے دھارے میں اِس قدر بہہ گئی کہ کتاب میری آغوش میں گر گئی۔ نبی کا چیلنج بڑا منطقی اور حقیقت شناس تھا۔ اُس نے سچائی بیان کی تھی۔

تین روز بعد میں نے ایک اور اجنبی سپنا دیکھا۔ دیکھتی کیا ہوں کہ اپنی خواب گاہ میں ہوں جبکہ ملازمہ نے بتایا کہ ایک عطر بیچنے والا مجھ سے ملاقات کا مشتاق ہے۔ اُن دنوں بیرونی عطر کی پاکستان میں قلت تھی مجھے بہت دُکھ تھا کہ میری پسندیدہ اشیاء میں کمی واقع ہو رہی تھی۔ بس میں نے ملازمہ کو حکم دیا کہ عطر فروخت کرنے والے کو اندر بلا لاؤ۔ وہ اُن عطر فروخت کرنے والوں کے لباس میں تھا جو میری ماں کے زمانے میں ہوا کرتے تھے۔ اُس وقت یہ سوداگر گھر گھر اپنی اشیاء فروخت کرتے تھے۔

وہ ایک لمبا سیاہ چُغہ پہنے تھا اور تھیلے میں اپنا سامان اٹھائے ہوئے تھا۔ اُس نے تھیلا کھولا اور اس میں سے ایک سبزی مائل مرتبان کھولا۔ ڈھکنا کھولتے ہوئے اس نے مرتبان مجھے تھما دیا۔ اُس پر نگاہ کرنے پر میں نے دم سادھ لی۔ عطر شفاف شیشہ کی طرح چمک رہا تھا میں اسے چھونے ہی والی تھی کہ عطر بیچنے والے نے اپنا ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ نہیں! اور میرے ہاتھ سے مرتبان واپس لیتے ہوئے اُس نے اُسے میرے سنگھار میز پر رکھ دیا۔ اور کہنے لگا کہ اس کی خوشبو دنیا بھر میں پھیل جائے گی۔

صبح اٹھنے پر بھی خواب میرے ذہن میں تازہ تھا۔ سورج کی کرنیں کھڑکی میں سے جھانک رہی تھیں۔ اور ابھی تک اُس عطر کی دلکش خوشبو سے دماغ معطر تھا۔ اِس کی مہک سے کمرہ بھرا ہوا تھا۔ میں نے اُٹھ کر اپنے پلنگ کے قریب پڑے ہوئے میز کو دیکھا۔ مجھے مدھم سی توقع تھی کہ سنہری مرتبان اُدھر پڑا ہوگا۔ مگر مرتبان کی جگہ میں نے بائیبل کو پڑے دیکھا میں لرز گئی۔ اِن دو خوابوں پر غور کرتے ہوئے میں اپنے پلنگ پر بیٹھ گئی اِن کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے؟ سالہا سال مجھے خواب نہیں آیا تھا اور اب اس قدر حقیقی اور سلسلہ وار خواب آ رہے تھے۔ کیا اِن سپنوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق تھا۔ کیا ان کا رشتہ مافوق الفطرت دُنیا کے حقائق سے تھا۔ اُس بعد از دوپہر میں معمول کے مطابق باغیچہ میں چہل قدمی کرنے لگی۔ ابھی تک میں اپنے خوابوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ مگر اب اِس میں اضافہ ہو چکا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میں ایک عجیب خوشی محسوس کر رہی ہوں۔ ایک اطمینان جس کو میں نے پہلے کبھی نہ پایا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میں خدا کی حضوری کے قریب ہوں۔ میں باغیچہ

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

سے نکل کر کھلے میدان میں آئی۔ سورج چمک رہا تھا۔ میرے چاروں طرف کی فضا معطر تھی۔ یہ پھولوں کی خوشبو نہ تھی۔ پھول کھلنے کا موسم گزر چکا تھا۔ بہرحال یہ ایک حقیقی سی مہک تھی۔ کچھ بے چینی کے عالم میں گھر کی طرف لوٹی۔ یہ مہک کہاں سے آئی تھی؟ میرے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ جو میرے ساتھ ہو رہا تھا میں اس کا ذکر کس کے ساتھ کر سکتی تھی۔ یہ کوئی ایسا شخص ہونا چاہیئے تھا جسے بائیبل کا کچھ علم ہو۔ میں نے مسیحی ملازموں سے دریافت کرنے کا خیال ترک کر دیا تھا۔

اولین اُن سے کسی قسم کی معلومات حاصل کرنا قابلِ خیال تھا۔ غالباً انہوں نے خود کبھی بائیبل کا مطالعہ نہ کیا ہوگا۔ اور وہ میری بات کو نہ سمجھ پائیں گے۔ مجھے کسی ایسے شخص سے بات کرنا ہے جو تعلیم یافتہ ہو، اور جسے اِس کتاب کا علم ہو۔ جب میں نے اِس سوال پر غور کیا تو مجھے ایک عجیب خیال گزرا۔ اِس خیال سے کشمکش جاری رہی۔ یہ مدد کے لئے جانے کے لئے آخری مقام ہوگا۔

میرے ذہن میں مسلسل ایک نام آتا رہا اور آخر کار میں نے منظور کو بُلا بھیجا۔ کاربار نکالو اور ساتھ ہی میں نے مزید کہا کہ میں خود کار چلاؤں گی۔ منظور کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ آپ خود! جی ہاں میں خود، جھجکتے ہوئے وہ چلا گیا۔ شام کو اِس قدر دلیری سے میں نے شاذ و نادر ہی کبھی کار باہر نکالی ہوگی۔

دوسری جنگِ عظیم میں بڑی فوج میں میں عورتوں کے دستہ میں تھی۔ اور میں نے ہر قسم کی گاڑیاں میلوں میل ہر طرح کے خطرے میں چلائی تھیں۔ مگر وہ جنگ کی بات تھی۔ اور اُس وقت کوئی نہ کوئی میرے ہمراہ ہوتا تھا۔ یہ توقع نہیں کی جاتی تھی کہ نواب کی صاحبزادی اس قدر اندھیرے

میں اپنی کار خود چلاتے۔ مگر میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے اقدام کا منظور کو پتہ چلے اور راز کھل جائے۔ مجھے یقین تھا کہ میں اپنے سوالات کا جواب صرف ایک جگہ ہی پا سکتی ہوں۔ یوحنا اصطباغی کون؟ یہ چاروں طرف مہک آخر کیا تھی؟ لہٰذا اُس شام میں بڑی مزاحمت کے ساتھ اُس جوڑے کے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ جن سے میں بخوبی واقف نہ تھی۔ یہ پادری مچل اور اُس کی بیگم تھے۔ وہ موسم گرما میں میرا باغیچہ دیکھنے بھی آئے تھے مسیحی مشنریوں میں وہ آخری لوگ تھے۔ جن سے میں تعلقات استوار کرنے کی مشتاق تھی۔

چوتھا باب

"مقابلہ"

منظور نے کار اسٹارٹ کی اور جب تک میں نہ آئی وہ کار میں ہی بیٹھا رہا۔ تاکہ کار گرم رہے۔ اُس کی سیاہ آنکھیں ابھی تک میرے فیصلہ پر شک کر رہی تھیں۔ مگر وہ منہہ سے کچھ نہ بولا۔ میں شام کے دھندلکوں میں کار چلاتی ہوئی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئی۔ میرے ساتھ والی سیٹ پر بائیبل پڑی تھی۔ واہ کے اُس گاؤں میں ہر کوئی ایک دوسرے کا واقف تھا۔ مسٹر مچل کا گھر واہ میں سیمنٹ فیکٹری کے قریب تھا۔ اُس فیکٹری میں ہمارے خاندان کا حصّہ تھا۔ اور یہ قصبہ سے کوئی پانچ میل دور تھی۔ مگر ایک چھوٹے سے عجیب معاشرے کا مرکز تھی۔ گھر فوجی بیرکوں کی طرح تھے۔ جو انگریز فوج کے لئے دوسری جنگ عظیم میں عارضی طور پہ بنائے گئے تھے۔ ٹین کی چھت جگہ جگہ سے دوبارہ مرمت کی گئی تھی۔

کار چلاتے وقت میں ایک اجنبی سے خوف اور توقع میں مبتلا تھی۔ اِس سے پیشتر میں کسی کرسچین مشنری کے ہاں نہیں گئی تھی۔ میں پُر اُمید تھی کہ میں پُر اسرار شخص یوحنا اصطباغی کے بارے میں جان سکوں گی۔ تاہم ابھی تک میں اُس خوف کی گرفت میں تھی، کہ یہ کہیں محض جواب

دینے والوں کا اثر رسوخ ہی نہ ہو۔ ایک مسیحی مشنری سے میری ملاقات کے بارے میں رشتہ دار کیا سوچیں گے۔ مثال کے طور پر میں نے اپنے دادا کے بارے میں سوچا جو افغانستان سے جنگوں میں مشہور انگریز جنرل نکلسن کے ہمراہ تھے۔ یہ ملاقات میرے خاندان پر کس قدر بے عزتی کا باعث ہو سکتی ہے۔ ہماری نگاہ میں مشنری کی کوئی خاص قدر و منزلت نہ تھی۔ میں نے تصورات میں اپنے انکل اور آنٹی سے گفتگو کی اور اپنے جانے کا مقصد اور مدعا بتایا۔ اور نتیجہ پر پہنچی جو ایسے خواب دیکھے گا وہ اُن کا مفہوم معلوم کرنے کے لئے ہر جگہ جا سکتا ہے۔

میں شام کے دھندلکے میں مچل کے گھر پہنچی۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد مجھے مچل کا بنگلہ مل گیا۔ یہ چھوٹا سا فرسودہ بنگلہ تھا۔ چاروں طرف شہتوت کے درخت تھے۔ دوسروں کی نظر سے بچنے کے لئے حفاظتی اقدام کے طور پر میں نے کار بنگلہ سے کچھ دور پارک کرنے کے بارے میں سوچا۔ پھر مجھے خیال گزرا کہ میں اپنے خاندان سے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہراساں ہوں۔ پس میں نے کار مچل کے گھر کے سامنے کھڑی کر دی۔ بائیبل اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے جلدی سے میں مچل کے گھر میں داخل ہو گئی۔ صحن اور برآمدہ خوب صاف ستھرا تھا اچانک دروازہ کھلا اور کچھ دیہاتی خواتین شلوار قمیض میں ملبوس گفتگو کرتی ہوئی برآمد ہوئیں۔ میں خوف سے لرز گئی۔ یقیناً انہوں نے مجھے پہچان لیا ہو گا۔ اب ہر جگہ چرچا ہو گا کہ بیگم ایک مسیحی مشنری سے ملاقات کو گئی۔ جونہی اُن عورتوں نے دروازے سے آئی ہوئی روشنی میں مجھے دیکھا میرے وسوسوں کے عین مطابق خاموش ہو گئیں اور

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

مجھے سلام کرتی ہوئی گلی میں داخل ہوگئیں۔ اِس کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا کہ میں اُس دروازہ کی جانب جاؤں جہاں مسز مچل کھڑی شام کے دھندلکے میں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے اُسے قصبہ میں پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔ امریکن ہونے کے باوجود دیہاتی عورتوں کی طرح وہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس کا منہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔ بڑی کشمکش میں اُس نے کہنا شروع کیا، آیئے آیئے بیگم شیخ! میں خوش تھی کہ میں دروازہ کے اندر ہوں اور دیہاتی عورتیں اب مجھے دیکھ نہیں رہیں۔ مجھے کمرے میں لے جاکر کرسی پر بٹھا دیا۔ اور خود کھڑی اپنے ہاتھ ملتی رہی۔ میں نے دائرے میں پڑی کرسیوں پر نگاہ کی۔ مسز مچل نے بتایا کہ میں ابھی دیہاتی عورتوں کو بائیبل پڑھا رہی تھی۔ جھجکتے ہوئے اُس نے مجھ سے پوچھا آپ چائے پیئیں گی؟ میں نے جواب دیا نہیں۔ شکریہ۔ میں ایک سوال کا جواب ڈھونڈنے آئی ہوں۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر میں نے پوچھا کیا پارسی مچل گھر میں ہیں مجھے یہ سُن کر افسوس ہوا کہ وہ افغانستان گئے ہوئے ہیں۔ مجھے شک تھا کہ کیا یہ نوجوان خاتون میرے سوالوں کا جواب دے سکے گی؟ میں نے مسز مچل سے کہا آپ خدا کے بارے میں کچھ جانتی ہیں؟ وہ کھڑکی کے قریب کرسی پر بیٹھ کر اجنبی سی نگاہوں کے ساتھ مجھے دیکھنے لگی۔ کمرہ میں صرف جلتی آگ کا مدھم سا شور تھا۔ پھر وہ کہنے لگی کہ میں خدا کے بارے میں تو اتنا نہیں جانتی مگر خدا کو جانتی ہوں۔ کیا غیر معمولی سا جواب تھا۔ وہ یہ کیونکر کہہ سکتی تھی کہ وہ خدا کو جانتی ہے۔ اِس خاتون کے اعتماد سے میرا اعتماد بھی کچھ بڑھ گیا۔

اِس سے پہلے کہ میں یہ معلوم کروں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے، میں

انجانے میں اُسے اپنے سینے تبارہی تھی کہ کیونکر حضرت مسیح اور یوحنا اصطباغی مجھے ملے۔ تباتے وقت میں اسی طرح جذباتی تھی، جس طرح پہاڑ پر یوحنا اصطباغی کے ساتھ قدرے آگے کی جانب جھکتے ہوئے میں مسز مچل سے مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ میں نے حضرت مسیح کے بارے میں تو سُنا ہے۔ مگر یہ یوحنا اصطباغی کون ہے؟ مسز مچل نے بے چین نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے یہ استفسار کرنا چاہتی تھی کہ کیا واقعی آپ نے اِس سے پہلے یوحنا اصطباغی کا نام نہیں سُنا؟ مگر سوال کئے بغیر ہی وہ سیدھی ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی اور کہنے لگی:

بیگم شیخ! یوحنا اصطباغی ایک پیغمبر تھے جن کا کام مسیح کی آمد کی خبر دینا تھا وہ لوگوں کو بدی سے توبہ کی تعلیم دیتے تھے۔ یوحنا ہی نے مسیح کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ دیکھو خدا کا برہ جو جہان کے گناہ اُٹھائے جاتا ہے۔ اِسی نے مسیح کو بپتسمہ بھی دیا۔

بپتسمہ کے لفظ پر میرا دِل اُچھل پڑا۔ مجھے اُن مسیحیوں کا تھوڑا سا علم تھا۔ لیکن تقریباً سب مسلمانوں نے بپتسمہ کی عجیب رسم کے بارے میں سُنا ہوا ہے۔ میرے ذہن میں اُن بہت سے لوگوں کا خیال آیا جن کو بپتسمہ لینے کے سبب سے قتل کر دیا گیا۔ اور یہ ہوا بھی برطانوی راج میں جبکہ مذہبی آزادی میسّر تھی۔ بچپن سے یہ دو حقائق میرے ذہن کی تختی پر نقش تھے کہ جونہی ایک مسلمان نے بپتسمہ لیا اُسے ہی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ میرا نام پکارتے ہوئے مسز مچل نے مجھے یاد دلایا کہ ہمیں خاموش بیٹھے ہوئے کتنی دیر ہو گئی ہے۔ بڑی مشکل سے میں نے کہا مسز مچل! تھوڑی دیر کے لئے بھول جاؤ کہ میں مسلمان ہوں۔ مجھے بتایئے

میں نے اُسے باپ کہنے کی جراءت کی

کہ جب آپ نے کہا کہ "میں خُدا کو جانتی ہوں"۔ تو اُس سے آپ کا کیا مطلب تھا؟ جواب میں مسز مچل نے کہا "میں یسوع کو جانتی ہوں" اور میں جانتی تھی کہ اپنے خیال کے مطابق وہ میرے سوال کا جواب دے رہی تھی۔ پھر وہ بیان کرنے لگی کہ انسانی روپ میں آکر کیونکر خدا نے گنہگار انسان اور اپنے درمیان جُدائی کی دیوار کو ہٹا دیا۔ صلیب پر ہمارے لئے مر کر یسوع نے یہ کام کیا۔ کمرے میں پھر سکوت چھا گیا۔ باہر سے ٹریفک کے گزرنے کی آواز آرہی تھی۔ مسز مچل کم گو تھی۔ بالآخر غیر متوقع طور پر یہ کہتے ہوئے میں نے سکوت کو توڑا کہ مسز مچل کچھ دیر سے ہمارے گھر میں عجیب واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ اچھی اور بُری روحوں کے درمیان تصادم ہے۔ مجھے ہر طرح کی مدد درکار ہے۔

کیا آپ میرے لئے دُعا کریں گی؟ میری اِس خواہش پر وہ خاتون حیران رہ گئی۔ اور اپنے خیالات کو سمیٹتے ہوئے کہنے لگی "کیا آپ دُعا کے لئے کھڑی ہونا یا گھٹنے ٹیکنا پسند کریں گی۔ میں ایک اُلجھن میں تھی۔ میں اِس سب کے لئے تیار نہ تھی۔ مگر اُسے دوزانوں دیکھ کر میں نے بھی دُعا کے لئے گھٹنے ٹیک دیئے۔ مسز مچل دھیمی آواز میں یُوں دُعا کرنے لگی "اے خدا تعالےٰ کے رُوح میں جانتی ہوں کہ کہنے پر کہ سچ کیا ہے۔ مسز شیخ قائل نہیں ہو سکتی۔ مگر میں تیرا شکر کرتی ہوں کہ تو ہماری آنکھوں سے پردہ ہٹا کر یسوع کو ہمارے دلوں پر ظاہر کر سکتا ہے۔ رُوح پاک بیگم شیخ کے لئے یہ کر۔ آمین

دُعا کے بعد میرا دل عجیب طور پر شاد ہو گیا تھا۔

بالآخر مسز مچل اور میں گھٹنوں سے اُٹھیں اور مسز مچل نے میرے ہاتھ میں کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا بیگم شیخ! کیا یہ بائیبل

ہے ؟ میں نے کتاب اُسے دکھائی۔ پُوچھنے لگی کہ آپ کو اُس سے کچھ ملا۔ جو آپ پڑھتی ہیں کیا آپ کو اُس کی سمجھ آتی ہے ؟ میں نے کہا کوئی خاص نہیں۔ یہ ایک پُرانا ترجمہ ہے۔ اور میری سمجھ سے باہر ہے۔ وہ ساتھ والے کمرے میں گئی اور ایک کتاب اُٹھا لائی۔ یہ جدید انگریزی ترجمہ ہے۔ یہ فلپس کا ترجمہ ہے۔ میں دوسروں کی نسبت اِسے زیادہ آسان سمجھتی ہوں۔ کیا آپ اِسے پسند کریں گی ؟ میں نے کتاب اُس کے ہاتھ سے لے لی۔ اور اُسے کہا کہ یوحنا کی انجیل سے شروع کر دو۔ اُس نے کتاب کھول کر وہاں نشان کے طور پر کاغذ رکھ دیا۔ یہ ایک اور یوحنّا ہے۔ مگر یہ یوحنا اصطباغی کے کام کو بہت صفائی سے بیان کرتا ہے۔ میں شکریہ کہتے ہوئے اُٹھی۔ کہا کہ اب میں چلتی ہوں۔ میں نے آپ کا بہت سا وقت لیا ہے۔

مسز مچل نے کہا کہ یہ دلچسپ بات ہے کہ ایک خواب آپ کو اِدھر لے آیا۔ خدا اکثر اپنے بچّوں کے ساتھ خواب اور رویا میں بات کرتا ہے جب وہ مجھے کوٹ پہنانے میں میری مدد کر رہی تھی تو مجھے خیال گزرا کہ کیا یہ مناسب ہے کہ میں اپنا دوسرا خواب بھی اُسے بتاؤں۔ وہ جو کہ عطر فروخت کرنے والے کے بارے میں تھا۔ یہ غیر معمولی سا لگتا تھا۔ مگر جیسے کئی بار پہلے ہو چکا تھا، اِس شام میں عجیب طور پر دلیر تھی۔ میں جانتی تھی کہ کوئی طاقت مجھے حیرت دلا رہی تھی۔ میں نے پوچھا مسز مچل، کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ مسیح اور عطر میں کوئی تعلق ہے۔ ایک لمحہ غور کرنے کے بعد کہنے لگی کہ میرا خیال ہے کہ کوئی نہیں۔ تاہم مجھے اُس سے متعلق دُعا کرنے کا موقع دیں۔ گھر کی جانب آتے ہوئے دوسری دفعہ مجھے اِس مہک کا تجربہ ہوا۔ اُس رات گھر پہنچنے پر میں نے یوحنا کی انجیل کا وہ

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

حصہ پڑھا۔ جہاں یوحنا کی انجیل کا مصنف یوحنا اصطباغی کا ذکر کرتا ہے۔ یہ اجنبی شخص اونٹ کے بالوں کا لباس پہنے بیابان میں رہتا تھا۔ اور لوگوں کو خداوند کی راہ تیار کرنے کی منادی کرتا تھا۔ اپنی خواب گاہ میں بیٹھے ہوئے مجھے خیال گزرا کہ یوحنا اصطباغی جو خدا کی طرف سے مسیح کی نشاندہی کرنے والا تھا کیا یہ وہی شخص تو نہیں۔ جو مجھے مسیح کی طرف لا رہا ہے۔ اِس خیال کو رد کرتے ہوئے میں سو گئی۔

اِس رات میں گہری نیند سوئی۔ مگر جوں ہی مؤذن نے نماز کیلئے بُلایا اور میری آنکھ کھُلی تو میں واقعات کو پھر صفائی سے دیکھنے لگی۔ رات بھر میں کس قدر گھٹیا خیالوں میں پڑی رہی تھی۔ مگر اب جب کہ مؤذن نے مجھے یاد دلایا کہ حقیقت کہاں ہے تو میں اپنے آپ کو بے چین کرنے والے مسیحی تاثرات سے محفوظ سمجھنے لگی۔ اِسی وقت ریشم اندر داخل ہوئی۔ مگر وہ چائے نہیں بلکہ ایک رقعہ اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھی۔ کہنے لگی کہ ابھی ابھی آیا ہے۔

یہ مسز مچیل کی طرف سے تھا۔ لکھا ہوا تھا کہ دوسرا کرنتھیوں دوسرا باب اور چودھویں آیت پڑھو۔ تھوڑی دیر تلاش کرنے کے بعد آیت مجھے مل گئی۔ اِسے پڑھنے پر میں حیران رہ گئی۔ لکھا تھا جو مسیح میں ہم کو ہمیشہ اسیروں کی طرح گشت کراتا ہے اور اپنے علم کی خوشبو ہمارے وسیلے سے ہر جگہ پھیلاتا ہے۔ میں نے بستر پر بیٹھے ہوئے حوالے کو دوبارہ پڑھا۔

جو خیالات ایک منٹ پہلے مرتب ہوئے تھے وہ درہم برہم ہو گئے مسیح کا علم خوشبو کی مانند پھیلتا ہے، خواب میں عطر فروخت کرنے والے نے سُنہری مرتبان میرے بستر کے قریب پڑی میز پر رکھتے ہوئے کہا تھا

کہ اِس عطر کی خوشبو ساری دُنیا میں پھیلے گی۔ دوسری صبح عین اُسی جگہ میں نے بائیسیل پڑی پائی تھی، جہاں مرتبان رکھا گیا تھا۔

یہ سب روزِ روشن کی طرح عیاں تھا اور میں اِس پر غور کرنا نہیں چاہتی تھی۔ روزمرّہ کے معمول کے مطابق میں نے چائے منگوانے کے لئے گھنٹی دی میں اِس معاملہ میں کھو جانا نہیں چاہتی تھی۔

اگرچہ مسز مچل نے مجھے دوبارہ آنے کی دعوت دی تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ نہ جاؤں۔ مصلحت کے پیشِ نظر میں اِس نتیجہ پر پہنچی کہ میں خود بائیسیل کی تفتیش کروں گی۔ تاہم ایک سہ پہر نورجہاں میرے کمرے میں دوڑتی ہوئی آئی۔ اُس کی آنکھوں سے حیرانگی ٹپک رہی تھی گھٹی گھٹی آواز میں کہنے لگی مسٹر اور مسز مچل آپ سے ملاقات کو آئے ہیں میں حیران تھی کہ وہ اِدھر کیونکر آ گئے۔ تاہم اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے میں نے ملازمہ سے کہا کہ انہیں ڈرائینگ روم میں بٹھاؤ۔ مسز مچل کی طبیعت اپنی بیگم کی مانند بڑی پُرخلوص اور ملنسار دکھائی دیتی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر اِس قدر خوش ہوئے کہ میں اپنی بے قراری بھول گئی۔ مسز مچل ہاتھ ملانے کی بجائے بڑے پیار سے مجھے گلے ملی۔ میں حواس باختہ رہ گئی۔ میرے خاندان کے کسی قریبی دوستوں میں سے کسی نے کبھی مجھے اِس طرح گلے نہیں لگایا تھا۔ میں سرد مہری سے پیش آئی۔ مگر یوں لگتا تھا کہ مسز مچل اس سے بالکل متاثر نہ ہوئی۔

ماضی کی یادوں کے پیشِ نظر مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی مضائقہ نہ تھا کہ اِس پُرتپاک ملاپ سے میں خوش تھی۔ اب ملاپ میں بناوٹ نہیں تھی اپنے خوش مزاج امریکی لہجہ میں ڈیوڈ مچل نے کہا "پھولوں والی خاتون" آپ کو مل کر خوشی ہوئی۔ میں نے مسز مچل پر نگاہ کی اور ہنستے ہوئے کہنے لگی

میں نے اُسے باپ کہنے کی جراءت کی

کہ ضروری ہے کہ میں آپ کو بتا دُں کہ جب آپ ہمارے گھر تشریف لائیں تو میں نے ڈیوڈ کو اسی وقت بذریعۂ تار اس کی خبر دینا چاہی تھی۔ کیونکہ جب سے موسم بہار میں ہم نے آپ کا باغیچہ دیکھا تھا، آپ کا ذکرِ خیر ہوتا رہتا تھا۔ تاہم میں آپ کا اصلی نام استعمال کرنے سے ڈرتی تھی۔ تاکہ آپ محفوظ رہیں۔ میں سوچ میں تھی کہ تار میں آپ کا نام کیونکر بیان کیا جائے۔ میں نے کھڑکی سے اُن پھولوں پر نگاہ کی۔ جن کا بیج آپ کے مالی نے دیا تھا۔ اور میرے ذہن میں یہ نام آیا۔ "پھولوں والی خاتون" آپ مجھے بلقیس کہہ کر پکار سکتے ہیں۔ اور وہ کہنے لگی کہ آپ مجھے سینو کہہ کر پکار سکتی ہیں۔ عجیب ملاقات تھی مجھے گمان تھا کہ اپنے مذہب کو قبول کرنے کے لئے وہ مجھ پر دباؤ ڈالیں گے۔ کوئی ایسی بات نہ ہوئی۔ چائے پیتے وقت ہم بات چیت کر رہے تھے۔ مجھے آپ کے یسوع کو خدا کا بیٹا کہنے پر اعتراض ہے۔ مسلمانوں کے لئے یہ کہنا گویا گناہِ کبیرہ ہے۔ قرآن میں بار بار آیا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے کوئی اولاد نہیں۔ اور یہ تثلیث ایک مسئلہ ہے۔ کیا تین خدا ہیں؟ جواب میں ڈیوڈ نے خدا کو سورج سے تشبیہہ دی یعنی سورج میں تین طرح کی قوتیں ہیں۔ مثلاً حرارت، روشنی اور تابانی۔ تینوں کے ملاپ سے سورج بنتا ہے اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ رخصت ہو گئے۔

پھر کئی روز تک میں تنہائی میں بائیبل اور قرآن کے مطالعہ میں مصروف رہی۔ میں قرآن کو اپنی زندگی سے وابستہ وفاداری کے طور پر پڑھتی تھی اور اپنی باطنی بھوک کو مٹانے کے لئے بائیبل کا مطالعہ کرتی تھی تو بھی کبھی کبھار میں بائیبل کو پکڑنے سے گریز کرتی تھی۔ آخر میں اس نتیجہ پر پہنچی کہ دونوں کتابیں مختلف ہیں۔ کیونکہ دونوں کے پیغمبروں

میں اختلاف تھا۔ لیکن جب میں بائیبل پکڑنے جھجک محسوس کرتی جو مجھے مسز محپل نے دی تھی تو میں اجنبی طور پر محسوس کرتی کہ میں کسی کی بے قدری کر رہی ہوں۔

گزشتہ ہفتہ میں ایک حسین دُنیا میں رہی تھی۔ پس ایک ایسے باغیچہ میں نہیں تھی جو میرے گھر میں لگا تھا۔ بلکہ ایک نادیدہ باغیچہ تھا۔ جو نئی رُوحانی پہچان میں میرے باطن میں لگا تھا۔ اس حسین نگری میں اولین میں اپنے دو خوابوں کے وسیلہ سے داخل ہوئی تھی۔ اور پھر میں اِس دُنیا سے دوبارہ اُس رات دوچار ہوئی، جب میں نے اپنے باغیچہ میں بے بیان جلالی حضوری دیکھی۔ اور میں نے اِسے دوسری دفعہ اُس وقت پہچانا جب میں ــــ نے اشارہ کی فرمانبرداری کی جو مجھے کھینچ کر محپل کے گھر لے گیا۔

اگلے چند دنوں میں آہستہ آہستہ اور صفائی سے میں نے معلوم کرنا شروع کر دیا کہ اپنی حسین دنیا میں لوٹ آنے کی کوئی راہ ہے۔ اور اِس مسیحی کتاب کا مطالعہ کرنے سے یوں لگتا تھا کہ میں دوبارہ اپنی حسین دُنیا میں آنے کی کلید کو حاصل نہ کر سکوں گی۔ پھر ایک روز ننھا محمود اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے ہوئے میرے پاس آیا۔ درد سے چلاتے ہوئے اس نے کہا ممی میرے کان! میں نے جھک کر بڑی احتیاط سے اس کا معائنہ کیا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا اگرچہ محمود ایسا بچہ نہیں تھا جو شکایت کرے۔ میں اُس کے چہرے پر بہتے ہوئے اشک دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے بستر پر لٹا دیا۔ اور اُس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے اُسے سُلانے لگی۔ اور پھر جب وہ سو گیا تو میں نے راولپنڈی میں ہولی فیملی ہسپتال ٹیلیفون کیا۔ ایک منٹ بعد ٹونی فون پر تھی۔ وہ اِس بات پر رضامند ہوئی کہ اگلی صبح بعد از دوپہر

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

محمود کا پُورا معائنہ کیا جائے گا۔ میں محمود کے ساتھ کمرے میں ٹھہر سکوں گی اور ملازمہ ساتھ کے چھوٹے کمرے میں۔ شام تک جگہ کا انتظام کر لیا گیا۔ ٹونی شام کو ڈیوٹی پر نہیں تھی۔ اور اُس نے وہ وقت ہمارے ساتھ بسر کیا۔ جلد ہی محمود اور اُس کی امّی کسی تصویر میں رنگ بھر کر آپس میں خوش ہو رہے تھے۔ محمود جس کتاب میں رنگ کر رہا تھا وہ اُس کی ممّی نے اُسے دی تھی۔ میں ٹیک لگا کر اپنے بستر میں بیٹھے بائیبل کے مطالعے میں مشغول تھی۔ میں قرآن بھی اپنے ساتھ لائی تھی۔ مگر اب تک میں قرآن کو محض ایک مذہبی فرض سمجھ کر پڑھتی تھی۔ اچانک کمرے کی روشنی چمکی اور گل ہو گئی۔ بجلی فیل ہو جانے سے کمرہ تاریک ہو گیا۔ میں نے کسی کو موم بتی لانے کو کہا۔ ایک منٹ میں ایک نن اپنے ہاتھ میں شمعل لئے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ خوش مزاجی سے اُس نے کہا مجھے اُمید ہے کہ آپ خفا نہیں ہوں گی۔ بہت جلد کچھ موم بتیوں کا انتظام کر دیا جائے گا۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔ وہ ڈاکٹر سینٹی آگو تھی۔ وہ دُبلے بدن کی تھی اور چشمہ لگاتی تھی۔ یہ فلپائنی ڈاکٹر سارے ہسپتال کی انچارج تھی۔

ہم ایک بار پہلے بھی ایک دوسرے سے ملی تھیں۔ جلد ہی ایک اور نن ہاتھ میں موم بتی لئے ہوئے آ گئی۔ روشنی سے کمرہ جگمگا اٹھا۔ محمود اور ٹونی اپنی باتوں میں مگن تھے۔ اور میں ڈاکٹر سینٹی آگو سے گفتگو کرتی رہی۔ وہ میری بائیبل کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر میں آپ کے پاس بیٹھ سکتی ہوں؟ ڈاکٹر سینٹی آگو کہنے لگی۔ یہ سوچتے ہوئے یہ محض دلجوئی ہے میں نے کہا بڑی خوشی سے۔ وہ میرے بستر کے قریب کرسی پہ بیٹھ گئی۔ اپنے چشمے اتار کر اپنی آنکھوں کو رومال سے صاف کرتے ہوئے گفتگو کرنے لگی۔ میرا دل اُس کے لئے کھلا تھا۔ مسلمان ہمیشہ ایسی

مقدس خواتین کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو دنیا کو ترک کر کے اپنے خدا اور عقیدہ کی خدمت کرتی ہیں۔ ہوسکتا ہے اُن کا عقیدہ صحیح نہ ہو۔ لیکن اِن کا خلوص ایک حقیقت تھا۔ بات چیت کے دوران میں بتا سکتی تھی کہ اِس خاتون کے ذہن میں کچھ ہے۔ یہ بائیبل تھی۔ سوالیہ نگاہوں سے میں نے اُسے بائیبل کو تکتے دیکھا تھا۔ آخرکار وہ آگے کی طرف جھکی اور بڑے پُر اعتماد لہجہ میں پوچھا۔ بیگم شیخ آپ کا بائیبل سے کیا کام ہے۔ میں نے جرأت کہا کہ میں خلوص سے خدا کی تلاش میں ہوں اور پھر پہلے تو قدرے جھجک کے ساتھ مگر بعد میں دلیری سے اپنی اور مچل کی ملاقات کا تذکرہ کیا اور اپنے قرآن اور بائیبل کے تقابل کے بارے میں بھی بتایا۔ میں نے کہا چاہے کچھ بھی ہو میں خدا کی تلاش کر کے رہوں گی۔ مگر میں آپ کے عقیدہ سے کچھ شش و پنج میں ہوں۔ میں پہچان رہی ہوں۔ اِس گفتگو میں میں کسی اہم بات کو چھو رہی ہوں۔ مجھے معلوم نہیں آپ خدا کو اِس قدر شخصی کیوں سمجھتے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے الفت ٹپک رہی تھی۔ آگے کی طرف جھکتے ہوئے اُس نے کہا بیگم شیخ! ہم ایسے کیوں محسوس کرتے ہیں۔ اُسے جاننے کا بس ایک ہی راستہ ہے۔ اور وہ یہ کہ آپ خود اُسے پرکھیں۔ اُس کے لہجہ میں جذبات کا رنگ تھا۔ ہوسکتا ہے یہ آپ کو عجیب دکھائی دے مگر آپ کو اپنا راستہ دکھائے۔ اُس سے ایک عزیز کی حیثیت سے بات کریں۔ میں اِس خیال سے کہ وہ کہیں مجھ سے تاج محل سے بات کرنے کی تجویز نہ پیش کر دے۔

تب ڈاکٹر سنیٹی آگر نے ایسی بات کہی جس سے بجلی سی میرے بدن میں دوڑ گئی۔ کچھ اور قریب آتے ہوئے اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ

میں نے اُسے باپ کہنے کی جراءت کی

میں لیتے ہوئے جبکہ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ خاموش لہجہ میں بولی " خدا سے بات کرو۔ اُس سے یوں بات کرو گویا کہ وہ آپ کا باپ ہے۔ میں جلدی سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ موت کا سا سکوت کمرے میں چھا گیا۔ ٹونی اور محمود کی گفتگو ان خیالوں میں حائل ہو گئی۔ میں نے بڑے غور سے شمع کی روشنی میں نن کی آنکھوں میں جھانکا۔ کیا میں خدا سے یوں بات کروں گویا کہ وہ میرا باپ ہے! اس خیال سے عجیب طور پر میری رُوح لرز گئی۔ یہ حقیقت ایک ہی وقت میں چونکا دینے والی اور قرار دینے والی تھی۔

پھر اچانک گویا ہر ایک نے گفتگو کا آغاز کر دیا۔ ٹونی اور محمود ہنستے ہوئے تصویر میں رنگ بھرنے لگے۔ ڈاکٹر سنیٹی آگو مسکراتی ہوئی اٹھی اور ہمیں خدا حافظ کہتے ہوئے چلی گئی۔

دُعا اور مسیحیت سے متعلق نذیر کچھ نہ کہا گیا تھا تو بھی میں نے کروٹیں لیتے ہوئے رات کاٹی۔ اور اگلی صبح میں پریشان تھی۔ یہ یہاں آنے کا تجربہ اور بھی پُراسرار بن گیا جب ڈاکٹر معائنہ کے دوران کانوں میں کوئی خرابی معلوم نہ کر سکے اور محمود بھی کہنے لگا کہ اُس کے کانوں میں ذرا بھر بھی درد نہیں۔

پہلے تو میں اُس سارے انتظام اور وقت ضائع کرنے کے سبب سے پریشان ہوئی۔ پھر مجھے خیال گزرا کہ شاید کبھی پُراسرار انداز میں خدا کا یہ انتظام تھا کہ میری ملاقات ڈاکٹر سنیٹی آگو سے ہو۔ دوسری صبح منظور ہمیں گاڑی میں واہ لے آیا۔ جونہی وہ شاہراہ سے ہوتا ہوا گلی میں آیا۔ میں درختوں میں سے اپنے گھر کی مٹیالے رنگ کی چھت کو دیکھ سکتی تھی۔ معمول کے مطابق میں گھر کو دنیا میں سکھ کا مرکز سمجھتی تھی۔

مگر آج گھر بھی مختلف تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہاں آج میرے ساتھ کوئی خاص واقعہ رونما ہونے والا ہے۔

گھر پہنچے پر منظور نے کار کھڑی کر کے ہارن دیا۔ نوکر دوڑتے ہوئے آئے۔ اور محمود کے بارے میں پوچھنے لگے۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ محمود ٹھیک ہے۔ مگر میرا ذہن گھر آنے کی خوشیوں میں نہیں تھا۔ بلکہ میری خوشی کا سبب خدا کو نئے انداز سے جاننے میں تھا اپنی خواب گاہ میں آ کر میں نے تمام واقعات پر غور و فکر کیا۔ میں نے خیال کیا کہ کوئی مسلمان اللہ کو باپ نہیں کہتا۔ بچپن ہی سے مجھے بتایا گیا تھا کہ اللہ کو جاننے کا سب سے یقینی طریقہ یہ ہے کہ پانچ وقت نماز ادا کی جائے اور قرآن پڑھ کر اُس پر دھیان کیا جائے تو بھی ڈاکٹر سنیٹی آگو کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے "خدا سے بات کرو" اُس سے یوں گفتگو کرو گویا کہ وہ آپ کا باپ ہو۔ اپنے کمرے میں گھٹنوں کے بل خدا کو باپ کہنے کی سعی کی مگر لاحاصل۔ میں مایوسی کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھی۔ خدا کو باپ کہنا میرے نزدیک اُس کی بے عزتی تھی۔ ایک گنہگار انسان اپنے خالق کو کیونکر باپ کہہ سکتا ہے خیالات کی جس رسہ کشی میں میں اُس رات سوئی اُس کا تجربہ مجھے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

آنکھ کھلنے پر معلوم ہوا کہ نصف رات بیت گئی ہے۔ بارہ دسمبر کا یہ روز میرا جنم دن تھا۔ آج میں ۴۷ برس کی تھی۔ مگر پہلے کی طرح اِس دن کو دھوم دھام سے نہیں منایا جائے گا۔ شاید چند فون آئیں گے اور بس۔۔۔ بچپن کی حسین یادیں میرے روبرو تھیں میں نے اپنے والدین کے بارے میں سوچا میرے لئے یہی سب سے بھلی

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

سوچ تھی۔ میری ماں پُروقار پُرالفت اور حسین تھی۔ مجھے اپنے باپ پر بہت مان تھا۔ ہندوستان کی حکومت میں وہ اعلےٰ عہدے پر تھے۔ میں ابھی تک تصوّر میں ان کی سج دھج دیکھ سکتی تھی۔ دفتر جانے سے پہلے کیونکہ وہ آئینہ میں اپنی پگڑی درست کرتے تھے۔ ان کے نقش تیکھے تھے اور چہرے پر مُسکراہٹ کھیلی رہتی تھی۔ انہیں مطالعہ میں مگن دیکھنے کی یاد مجھے بھلی لگتی تھی۔

ایسے معاشرہ میں بھی جہاں لڑکوں کو لڑکیوں سے زیادہ وقعت دی جاتی ہے۔ میرا باپ کوئی فرق روا نہیں رکھتا تھا۔ اکثر ایک چھوٹی لڑکی کی حیثیت سے میں اُن سے سوال پوچھا کرتی تھی۔ میں اُن کے دفتر میں جھانکا کرتی تھی۔ اُن کے کام میں مداخلت کرنے سے مجھے جھجک نہیں آتی تھی۔ اُن کی نگاہیں اکثر مجھے پکڑ لیتی تھیں۔ اپنا قلم نیچے رکھتے ہوئے وہ اپنی کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھ جاتے اور پکارتے "کیکا"! آہستہ آہستہ سر جھکائے ہوئے میں اُن کے پاس سے جانے لگتی۔ وہ مسکراتے ہوئے اپنے پاس پڑی کرسی پر تھپکی مار کر کہتے "پیاری بیٹی آؤ بیٹھو۔ پھر وہ اپنے بازو سے مجھے گلے لگاتے اور بڑے نرم لہجے میں کہتے ننھی "کیکا" اب میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ میرے والد کا ہمیشہ مجھ سے یہی سلوک ہوتا تھا۔ وہ میری مداخلت سے خفا نہیں ہوتے تھے۔ جب کبھی میرا کوئی سوال یا مسئلہ ہوتا وہ اپنی مصروفیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مجھے اپنی ساری توجہ دیتے۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی میں بستر پر پڑی ان حسین یادوں سے لُطف اندوز ہو رہی تھی۔ میں نے کہا "اے اللہ تیرا شکر ہو"

یکایک مجھے خیال آیا کہ کیا میں بات کر رہی ہوں؟ اُمید کی ایک کرن دکھائی دی۔ فرض کرو کہ اللہ تعالیٰ باپ کی حیثیت رکھتے ہیں اب اگر میرا جسمانی باپ میری بات سننے کے لئے پوری توجہ دے سکتا تھا تو کیا میرا آسمانی باپ میری طرف متوجہ نہ ہوگا! جذبات سے مغلوب ہو کر میں بستر سے اُٹھ بیٹھی۔ زمین پہ گھٹنوں کے بل دوزانوں ہو گئی۔ آسمان کی طرف نگاہ کی اور اس نئی سمجھ بوجھ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو باپ کہہ کر پکارا جس طرح مجھے جواب ملا اُس کے لئے میں تیار نہیں تھی۔

پانچواں باب

"چورا ہے"

اے باپ! میرے باپ، کہتے ہوئے میں نے قدرے جھجک سے اونچی آواز میں خدا کو باپ کہا۔ اللہ تعالیٰ سے بات کرنے کے لئے میں نے مختلف طریقے آزمائے اور پھر گویا کہ میرے باطن کے بندھن ٹوٹنے لگے اور مجھے حقیقت میں یہ یقین ہونے لگا کہ جس طرح میرا جسمانی باپ ہمیشہ میری سُنتا تھا اسی طرح آسمانی باپ میری سُن رہا ہے۔

مزید اعتماد کے ساتھ میں نے اللہ تعالیٰ کو باپ کہہ کر پکارا بستر کے قریب اس بڑے کمرے میں دُعا کرتے وقت میری آواز معمول سے قدرے بلند تھی۔ یکایک مجھے خدائے تعالیٰ کی حضوری کمرے میں محسوس ہوئی۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی پیار سے میرے سر پہ ہاتھ رکھ رہا ہو۔ یوں لگتا تھا کہ میں اُس کی رحم اور اُلفت سے لبریز آنکھوں میں جھانک کر دیکھ سکتی ہوں۔ میں گویا ایک چھوٹی بچی کی مانند اپنے باپ کے قدموں میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اِسی حالت میں

کافی دیر تک میں اُس کی محبت کے بے بیان بحر میں بہتی رہی۔ میں اُس سے بات کر رہی تھی۔ میں اِس بات کے لئے اُس سے معافی کی خواستگار تھی۔ اسے پہلے کیوں نہ جان سکی؟ ایک بار اور اُس کی اُلفت کی لہر نے مجھے چھُو کر گرما دیا۔

اب میں نے پہچانا کہ یہ وہی حضوری ہے، جس سے میری ملاقات اُس بعد از دوپہر اپنے باغیچہ میں خوشبو کی صورت میں ہوئی تھی۔ میں نے کہا اے باپ اچھا ہے کہ اِس بات کا فیصلہ ابھی ہو جائے۔ میں اپنے بستر کے قریب میز کی طرف گئی جہاں میں نے قرآن اور بائیبل ساتھ ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ میں نے دونوں کتابوں کو پکڑا اور دونوں ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے اُوپر کیا اور کہنے لگی "اے باپ! اِن میں تیری کتاب کون سی ہے؟ پھر ایک نمایاں بات وقوع پذیر ہوئی۔ اِس طرح میری زندگی میں کبھی پہلے نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ میں نے اپنے باطن میں ایک آواز سنی۔ ایک آواز جو ایسی صاف تھی کہ میں اپنے ذہن کی باطنی حالت میں اُنہیں دہرا سکتی تھی۔ وہ الفاظ تازہ اور محبت سے بھرے ہوئے تھے۔ اور ساتھ ساتھ اُن میں اختیار کا رنگ حاوی تھا۔

کون سی کتاب میں تم مجھے ایک باپ کی حیثیت سے پاتی ہو؟

میں نے جواب دیا بائیبل میں! اب میرا ذہن ایک طرف ہو گیا تھا۔

میں نے اپنی گھڑی پر نگاہ کی اور یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ تین گھنٹے گزر چکے تھے تو بھی میں تھکی نہیں تھی۔ میری خواہش تھی کہ دُعا میں مشغول رہوں۔ میں بائیبل کا مطالعہ کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

اَب میں جانتی تھی کہ اِس کے وسیلے سے میرا باپ مجھ سے بات کریگا
میں صرف صحت ملحوظِ خاطر رکھتی ہوئی بستر میں گئی۔ اگلی صبح میں
نے اپنی ملازمہ کو حکم دیا کہ جب تک میں نہ بُلاؤں کمرے میں نہیں
آنا۔ اور کسی طرح کی مداخلت نہیں ہونی چاہیئے۔ میں نے انجیل
مقدس کو شروع سے پڑھنا شروع کر دیا۔

میں متاثر ہوئی کہ کس طرح خُدا نے متی کی انجیل کے پہلے حصّہ
میں ہی پانچ بار خوابوں میں کلام کیا۔ مریم کے لئے اُس نے یوسف
سے کلام کیا۔ اُس نے مجوسیوں کو ہیرودیس کے بارے میں خبردار
کیا اور تین بار اُس نے بچے یسوع کی حفاظت سے متعلق یوسف کو
آگاہ کیا۔ مطالعۂ بائیبل کی بھوک نہیں مٹتی تھی۔ بائیبل میں خدا
کے قریب لانے میں میری رہنمائی کر رہی تھی۔

میں نے اپنے آپ کو ایک بڑے چوراہے پر کھڑے پایا۔ اب تک
میں شخصی طور پر خدا باپ سے ہی واقف تھی۔ میں اپنے دل میں جانتی تھی
کہ مکمل طور پر یا تو مجھے اُس کے بیٹے کے ہاتھ میں اپنے آپ کو سُپرد
کر دینا ہوگا یا مکمل طور پر اس سے منہ موڑ لینا ہوگا۔

اور یقینی طور پر میں جانتی تھی کہ میرے عزیزوں میں سے ہر
ایک مجھے یسوع کو ترک کر دینے کی تلقین کرے گا۔ میرے ذہن کی
سطح پر پُرانی یادیں تازہ ہو رہی تھیں مجھے وہ دن یاد آ رہا تھا جب
میرے والد مجھے خاندانی مسجد لے کر گئے۔ ہمارے سوا وہاں اور کوئی
نہ تھا۔ ہم مسجد کی عالیشان عمارت میں داخل ہوئے۔ میرا ہاتھ تھامے
ہوئے ابو جی نے فخریہ انداز میں مجھے بتایا کہ ہمارے خاندان نے بیس
پشتوں سے یہاں نماز پڑھی ہے۔ اور پھر سے یوں ہمکلام ہوئے کہ

قدر عظیم مرتبہ ہے کہ تم اِس قدیم حقیقت کا ایک حصّہ ہو۔

مجھے ٹونی کا خیال آیا۔ یقیناً یہ جوان سال خاتون پہلے ہی فکروں کے پہاڑ تلے دبی ہوئی ہے۔ اور پھر میرے دوسرے بچوں کا کیا ہوگا۔ اگرچہ وہ کافی فاصلے پر مقیم تھے۔ تو بھی میرے مسیحی ہونے سے انہیں صدمہ ہوگا۔ اور پھر مجھے انکل فتح کا خیال آیا۔ جس نے اُس روز مجھے بڑے فخر سے دیکھا تھا۔ جب میں چار برس چار ماہ اور چار روز کی تھی، اور تلاوتِ قرآن سیکھنا شروع کیا تھا۔ اور پھر میری عزیزہ آنٹی آمینہ اور دوسرے رشتہ دار کیا سوچیں گے جن کی تعداد سو کے قریب تھی۔ میں بہت بڑی برادری کا ایک حصہ تھی۔ اور ہر فرد دوسرے کی فلاح وبہبود کا ذمہ دار تھا۔ میں کئی پہلوؤں سے اپنے خاندان کے لئے نقصان کا باعث بن سکتی تھی۔ میں اپنے رشتہ داروں کی جوان لڑکیوں کی شادی میں خلل انداز ہوسکتی تھی۔ مسیحی ہونے کے سبب سے اُنہیں میرے اِس فیصلے کے سائے میں زندہ رہنا پڑے گا۔

بایں ہمہ میں اپنے نواسے محمود کی طرف سے فکرمند تھی۔ اُس پر کیا بیتے گی۔ محمود کے والد کا خیال آتے ہی میرا دِل ڈوب گیا۔ وہ اپنی مرضی منوانے کا عادی تھا۔ میرے مسیحی ہونے کے سبب سے مجھے غیر ذمہ دار قرار دے کر وہ محمود کو مجھ سے لے سکتا تھا۔ اس روز اپنے کمرے میں محوِ مطالعہ اور سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اور یہ خیالات میرے دل کو بے قرار کئے ہوئے تھے۔ اچانک میں نے اُس درد کو محسوس کیا جس میں دوسروں کو مبتلا کر سکتی تھی۔ میں نے اِسے اِس قدر شدت سے محسوس کیا کہ میں بے چینی میں اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ میں نے شال اوڑھی اور سردی کے موسم میں اپنے باغ میں

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

چلی گئی جو گویا کہ میری پناہ گاہ تھی جہاں میں بہترین طور پر سوچ سکتی تھی۔

میں نے چلتے ہوئے کچھ اس طرح دُعا کی "اے خداوند! کیا حقیقت میں تو چاہتا ہے کہ میں اپنے خاندان کو ترک کر دوں؟" کیسا خدائے محبت چاہتا ہے کہ میں دوسروں کو درد میں مبتلا کر دوں؟ اپنی سوچوں کے تاریک سائے میں خداوند کے وہ الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے جو میں نے ابھی متی کی انجیل میں پڑھے تھے "جو کوئی ماں باپ کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔ جو کوئی بیٹی بیٹے کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔ ... (متی ۱۰ : ۳۷ : ۳۸)

یسوع کے الفاظ میں میانہ روی اور اپنے ساتھ کسی سے مقابلے کا عنصر نہیں تھا۔ اُس کے الفاظ دوٹوک تھے۔ جنہیں میں سُننا پسند نہیں کرتی تھی۔ بہرصورت میں فیصلے کو بوجھ کی طوالت دینے کی مجاز نہیں تھی۔ میں نے جلدی سے گھر کے اندر آ کر منظور کو بُلا بھیجا اور ملازمہ کو اپنے اچانک راولپنڈی جانے کے فیصلے کے بارے میں بتایا۔ میں نے بتایا کہ میں چند روز کے لئے جا رہی ہوں۔ اور میری ضرورت پڑنے پر آپ مجھے میری بیٹی کے گھر مجھ سے رابطہ قائم کر سکتی ہیں راولپنڈی پہنچ کر میں نے کئی روز شاپنگ میں بسر کئے۔ یہ حیران کن بات نہیں تھی کہ اپنی جسمانی مصروفیات میں میں خداوند سے دور ہٹتی گئی۔ ایک جگہ جب ایک دوکاندار نے کپڑے کا ٹکڑا میرے سامنے پھیلایا اور مجھے صلیب کی شکل دکھائی دی۔ دوکاندار پہ ایک نگاہ ڈالتے ہوئے میں کچھ خریدے بغیر دکان سے چل دی۔ دوسری صبح میں واہ میں

تھی ۔ میں کسی فیصلے کو نہ پہنچ سکی ۔

پھر ایک شام گھر میں آگ تاپتے ہوئے میں نے انجانے میں بائیبل کو اٹھا لیا ۔ محمود بستر میں تھا ۔ میں ڈرائنگ روم میں خاموش بیٹھی تھی ۔ کھڑکی سے ہوا کے جھونکے اور آگ کے ٹمٹمانے کے سوا کمرے میں سکوت طاری تھا ۔ میں چاروں اناجیل اور رسولوں کے اعمال کا مطالعہ کر چکی تھی ۔ اِس شب میں بائیبل کی آخری کتاب تک پہنچ چکی تھی ۔ اگرچہ اِسے بہت کم سمجھتی تھی تو بھی مکاشفہ کی کتاب سے میں بہت متاثر تھی ۔ اجنبی سے اعتماد کے ساتھ یوں لگتا تھا کہ کوئی مجھے ہدایت کر رہا ہے ۔ اور پھر یکایک میں ایک ایسے فقرہ تک پہنچی جس نے میری دنیا بدل دی ۔ یہ مکاشفہ کے تیسرے باب کی بیسویں آیت تھی ۔

"دیکھ میں دروازہ پر کھڑا ہوا کھٹکھٹاتا ہوں ۔ اگر کوئی آواز سُن کر دروازہ کھولے گا ، تو میں اُس کے پاس اندر جا کر اُس کے ساتھ کھانا کھاؤں گا اور وہ میرے ساتھ ۔"

" اور اُس کے ساتھ کھانا کھاؤں گا ' اور وہ میرے ساتھ ! میں دم سادھے بیٹھی تھی اور کتاب میری گود میں پڑی تھی ۔ یہی میرا خواب تھا ۔ ایک ایسا خواب جس میں یسوع میرے ساتھ کھانا کھا رہا تھا ! اُس وقت مجھے مکاشفہ نام کی کسی کتاب کا کوئی علم نہ تھا ۔ اپنی آنکھیں موندھ کر میں اُس خواب کی تصویر میں یسوع کو اپنے روبرو میز پر بیٹھے دیکھ سکتی تھی ۔ اُس کی مُسکراہٹ میں میں اپنے لئے اُس کی اُلفت کو محسوس کر سکتی تھی ۔ اُس کے چہرے پر آسمانی باپ کا

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

سا جلال تھا۔ اس کی حضوری میں یہ جلال تھا۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ میری خواب خدا کی طرف سے تھی۔ راستہ صاف تھا۔ میں اُسے قبول کر سکتی تھی۔ یا اُسے رد کر سکتی تھی۔ میں دروازہ کھول سکتی تھی، اور اُسے ہمیشہ کے لئے اپنے اندر آنے کے لئے کہہ سکتی تھی، یا میں دروازہ بند رکھ سکتی تھی۔ مجھے اپنے فیصلے کو آخری شکل دے کر منزل کا چناؤ کرنا تھا۔

مصمم ارادہ کے ساتھ میں نے آگ کے قریب گھٹنے ٹیک دیئے اور یوں دُعا کرنے لگی۔ اب اور انتظار نہ کر برائے کرم میری زندگی میں آ۔ میری زندگی کا ہر پہلو تیرے لئے کھُلا ہے۔ مجھے جدوجہد یا فکر کرنے کی کوئی حاجت نہیں تھی کہ کیا ہوگا۔ میں نے ایک مثبت فیصلہ کیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ مسیح اب میری زندگی میں ہے۔ میری زندگی کے یہ حسین ترین واقعات تھے۔ چند ہی روز میں میں خدا باپ اور خدا بیٹے سے واقف ہوگئی تھی۔ میں اٹھی اور سونے کی تیاری کرنے لگی۔ میرا ذہن گردش میں تھا۔ کیا میں نے ایک مزید قدم اٹھانے کی جرارت کی ہے؟ مجھے یاد آیا کہ اعمال کی کتاب میں پنتکست کے روز یسوع نے اپنے شاگردوں کو رُوح القدس سے بپتسمہ دیا تھا۔ اپنا سر تکیے پر رکھتے ہوئے میں نے کہا۔ کیا مجھے بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنا ہے؟ میں نے دُعا کی کہ "اے خداوند تیرے سوا کوئی مجھے راہ دکھانے والا نہیں ہے۔ اگر تیری مرضی ہے کہ میں رُوح القدس سے بپتسمہ پاؤں تو بہرصورت میں وہی چاہتی ہوں۔ جو تو چاہتا ہے۔ میں تیار ہوں یہ جانتے ہوئے کہ میں نے مکمل طور پر اپنے آپ کو اُس کے ہاتھوں میں سونپ دیا ہے میں سو گئی۔

۲۴ دسمبر ۱۹۶۶ء کو علی الصبح میری آنکھ کھل گئی۔ تین بجے کا وقت تھا۔ کمرہ سرد ہونے کے باوجود میں بستر سے نکل کر سرد قالین پر گھٹنوں کے بل ہو گئی اوپر نگاہ کرنے سے یوں لگا کہ میں ایک عظیم روشنی دیکھ رہی ہوں۔ میری آنکھوں سے اشک جاری تھے۔ اپنے خالق کی جانب اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے میں پکار اُٹھی "اے خدا باپ مجھے روح القدس سے بپتسمہ دے۔"

میں نے اپنی بائبل لی اور وہاں سے کھولی جہاں یسوع کا ارشاد تھا "یوحنا نے تو پانی سے بپتسمہ دیا۔ مگر تم تھوڑے دنوں کے بعد روح القدس سے بپتسمہ پاؤ گے (اعمال ۱:۵) میں نے پکار کر کہا اے خداوند اگر تیرے یہ الفاظ سچ ہیں تو پھر یہ بپتسمہ مجھے ابھی عطا کر۔ میں سر دفرش پر سرنگوں ہو گئی سسکیوں کے دوران میں یہ کہہ رہی تھی کہ جب تک تو مجھے یہ بپتسمہ نہ دے میں اس جگہ سے ہرگز نہیں اٹھوں گی۔ اچانک میں خوشی اور خوف کے ملے جلے جذبات سے معمور ہو گئی۔ کیونکہ صبح کے تڑکے میں میں نے خداوند کا چہرہ دیکھا بجلی کے کرنٹ کی لہر میرے بدن میں سے گزر گئی۔ میری روح کو پوتر کرنے والی یہ لہریں ایک بحر کی مانند تھیں۔ چاندی سے لے کر تلوے تک میری روح دُھل چکی تھی۔ میں پورے طور پر صاف تھی۔ پھر اس پُر زور کرنٹ کا زور مدھم ہونے لگا اور آسمانی سمندر ساکت ہو گیا۔ میں خوشی سے پھولے نہیں سماتی تھی۔ اور میں اونچی آواز میں اُس کی حمد و شکر کرنے لگی۔

کئی گھنٹے اسی حالت میں رہنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ خداوند مجھے پاؤں پر کھڑا کر رہا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اب اُٹھوں۔

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

میں نے کھڑکی میں سے نگاہ کی اور دیکھا کہ دن چڑھنے والا ہے۔ اپنے بستر پر لیٹے ہوئے میں نے کہا اے خداوند جس فردوس کا تُو نے ذکر کیا ہے۔ کیا وہ اس سے کچھ بہتر ہوگا؟ تجھے جاننے میں مسرت ہے۔ تیری پرستش میں حقیقی خوشی ہے اور تیری قربت میں اطمینان ہے اور یہی جنّت ہے۔

شاید اُس صبح میں دو گھنٹے سوئی ہوں گی۔ تھوڑی دیر میں ملازمہ لباس پہننے میں میری خدمت میں آموجود ہوئی۔ یہ پہلی صبح تھی جس میں میں نے کرخت لہجے سے کام نہ لیا۔ سورج کی کرنیں کمرے میں خوفشانی کر رہی تھیں۔ ریشم میرے بالوں کو کنگھی کرتے گنگنا رہی تھی۔ پہلے اُس نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔

دن بھر میں خداوند کی تعریف میں مگن اور خوشی سے معمور اپنے گھر ٹہلتی رہی تھی۔ دوپہر کے کھانے پر محمود میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا "ممّی! آپ اِس قدر خوش دکھائی دیتی ہیں۔ اِس خوشی کا کیا سبب ہے؟" ہاتھ بڑھا کر میں نے پیار سے اس کے سیاہ بالوں کو چھُوا۔ اور اِس کا جواب دینے کی بجائے میں نے بیرے سے کہا کہ اُسے اور حلوا دو۔ پھر میں نے محمود کو بتایا کہ ہم محل کے ہاں کرسمس منائیں گے۔ محمود نے سوالیہ انداز میں کہا "کرسمس!" میں نے کہا کہ ماہِ رمضان کے بعد یہ بھی عید کی طرح اچھے اچھے کھانے پکانے اور خوشی منانے کا دن ہے۔ محمود سمجھ گیا۔ میرا خیال ٹھیک تھا۔ محل نے دروازے پر ہی ہمیں خوش آمدید کہا۔ ہمارے چاروں طرف پکوان کی خوشبو تھی۔ اور کمرے میں سے قہقہے گونج رہے تھے۔ وہ ہمیں ڈرائینگ روم میں لے گیا۔ کمرہ خوب سجا ہوا تھا۔ اور محل کے

دونوں بچوّں کی ہنسی دوسرے کمرے سے سُنائی دے رہی تھی ۔ محمود سے عمر میں یہ بچے کچھ بڑے تھے، تو بھی محمود خوشی سے اُن کے ساتھ کھیل میں مشغول ہو گیا۔

میرے لئے اپنی خوشی کو سنبھالنا مشکل تھا۔ بغیر سوچے ڈیوڈ سے مخاطب ہوتے ہوئے میں کہنے لگی " ڈیوڈ" ! اب میں مسیحی ہوں ۔ مجھے روح القدس کا بپتسمہ بھی ہوا ہے ۔

وہ حیرانگی سے مجھے تکتے ہوئے پوچھنے لگا کہ آپ کو روح القدس کے بپتسمہ کے بارے میں کس نے بتایا ہے ۔ خداوند کی تعریف کرتے اور ہنستے ہوئے اس نے پھر پوچھا آپ کو کس نے یہ بتایا ہے ۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا " یسوع نے مجھے بتایا ہے۔ میں نے بائیبل میں سے اعمال کی کتاب میں پڑھا ہے ۔ میں نے خدا سے روح القدس مانگا اور اُس نے مجھے عطا کیا۔ وہ دونوں میاں بیوی ششدر رہ گئے۔ پھر اچانک وہ میری طرف لپکے مسز جیل مجھ سے بغلگیر ہوئی ۔ جذبات سے مغلوب دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے ۔ ہم تینوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے وہاں کھڑے تھے ۔ ہم اُس کام کے لئے خدا کی تعریف کر رہے تھے، جو اس نے کیا تھا۔

اُس رات میں نے ڈائری لکھنی شروع کی جس میں میں نے اُن واقعات کا ذکر کیا، جو خداوند نے میری زندگی میں کئے تھے ۔ مجھے موت کا اب کوئی خوف نہیں تھا۔ جب یہ بات باہر نکلے گی کہ میں مسیحی ہو گئی ہوں ۔ میں یہ جانتی تھی کہ یہ میرا ریکارڈ ہے ۔ اپنی میز پر بیٹھی اپنا تجربہ لکھتے ہوئے مجھے کوئی علم نہیں تھا کہ وہ میری تعلیم کے لئے تیاریاں کر رہا ہے ۔

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

چھٹا باب

(اُس کی قُربت میں رہنے کا سبق)

تین بار خدا کی حضوری سے واقفیت کے بعد اگلے کئی روز حیران کن واقعات میرے منتظر تھے۔ جو تجربہ مجھے اب ہوا وہ دو خوابوں میں مختلف تھا۔ اِس تجربہ نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ایک سہ پہر بستر میں آرام کرتے ہوئے میں اپنے خداوند کے خیالوں میں تھی کہ یکایک میں نے محسوس کیا کہ پرواز کرتی ہوئی میں کھڑکی میں سے باہر جا رہی ہوں۔ یقیناً میں بند میں نہیں تھی۔ پرواز کی حالت میں مَیں نے اُوپر سے زمین پر نظر کی میں اس قدر خوفزدہ ہو گئی کہ مارے خوف کے چِلّائی اور یکایک میں نے محسوس کیا کہ میں واپس اپنے بستر پر آ گئی ہوں۔ میں مدہوشی کی حالت میں پڑی ہانپ رہی تھی۔ اور اپنی ٹانگوں میں سرسراہٹ سی محسوس کر رہی تھی۔ میں نے خداوند سے دُعا میں اِس کا مطلب پوچھا اور تب مجھے معلوم ہوا کہ اُس نے مجھے ایک خاص تجربہ دیا ہے میں نے معافی چاہتے ہوئے کہا کہ خداوندا تو نے ایسے تجربے کے لئے مجھ جیسی بزدل کو چُنا ہے۔

اُسی رات کے آخری پہر میں یہ تجربہ پھر مجھے ہوا۔ فرق صرف یہ تھا کہ

اِس بار تجربے کے دوران میں نے خداوند کو بتایا کہ میں ہراساں نہیں ہوں۔ جونہی میں اپنی کھڑکی سے واپس آئی مجھے گمان ہوا کہ میں روحانی طور پر پرواز کرتی رہی تھی۔ میں نے خداوند سے اس کا سبب پوچھا۔

بائیبل کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے میں نے خدائے تعالیٰ سے اس کی تفتیش کی کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں یہ خداوند کے کلام کے خلاف نہ ہو۔ یہ پڑھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ کیونکہ رسولوں کے اعمال (۸ : ۳۹) میں خداوند کا روح فلپس کو حبشی خوجہ کے بپتسمہ کے بعد اُشدود کے شہر میں لے گیا جو کافی فاصلے پر تھا۔ جب میں نے پولوس کے کرنتھیوں کی کلیسیا کے دوسرے خط کا مطالعہ کیا تو اس کی مزید تصدیق ہوگئی۔ بارہویں باب میں وہ خداوند کی طرف سے رویا اور مکاشفوں کا ذکر کرتا ہے۔ اُس نے اپنے تیسرے آسمان تک اٹھائے جانے کے بارے میں لکھا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ صرف خدا کو معلوم تھا کہ یہ حقیقی جسمانی تجربہ تھا۔ اور اس کے بعد پولوس رسول نے لکھا کہ "اس آدمی نے ایسی باتیں سُنی جن کا کہنا آدمی کو روا نہیں۔"

مگر میں نظاروں کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتی۔ ایسے ایک تجربہ کے دوران میں نے ایک مینار آسمان کی طرف اُٹھتے ہوئے دیکھا۔ اچانک میرے رُوبرو سینکڑوں گرجا گھر تھے۔ ان میں نئے پُرانے اور مختلف طرز سے تعمیر کئے ہوئے تھے۔ تب میں نے ایک قصبوں اور شہروں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ جن میں ہر ساخت کے گاؤں اور شہر شامل تھے۔

پھر جونہی میں نے سرخ گھوڑے پر سوار ایک شخص دیکھا جس

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرات کی

کے دائیں ہاتھ میں تیز تلوار تھی تو میرا دل خوف سے کانپ گیا۔ تو وہ بادلوں کو چھوتا اور کبھی دھرتی کو۔ میں ان احساسات پر قابو پانے سے قاصر تھی کہ یہ تجربات خاص وقت کے لئے مجھے دیئے گئے ہیں جو ابھی تک میرے فہم میں نہیں تھا۔

بائیبل پڑھتے وقت میں یہ محسوس کرتی تھی کہ محض اسے پڑھنے کے علاوہ میں گویا روزمرہ ہی رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے میں اس کے اوراق میں سے گزر کر فلسطین کی اس قدیم دنیا میں چلی جاتی جہاں کبھی یسوع مسیح گلیل کی پتھریلی راہوں پر چلا کرتا تھا۔ میں اُسے تعلیم دیتے اور اُس تعلیم کے مطابق زندگی بسر کرتے دیکھا اور یہ کہ کیونکر وہ عجیب کام انجام دیتا تھا۔ بالآخر اُس نے صلیب اُٹھائی فتح مندی سے موت کے تجربہ میں سے گزرا میں نے یہ بھی دریافت کیا کہ میرے بائیبل پڑھنے کے اثرات دوسرے لوگ محسوس کرنا شروع کر رہے ہیں۔ یہ اُس روز پتہ چلا جب میری ملازمہ میرے غسل کا بندوبست کر رہی تھی۔ نورجہاں بڑے میں کنگھیاں اور برش رکھ رہی تھی کہ اچانک اُس سے تمام چیزیں گر گئیں۔ بہت شور ہوا اور اُس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اور یقیناً میں اُسے بُرا بھلا کہنے والی تھی کہ میں نے اپنے آپ کو روک لیا۔ اِس کے برعکس مَیں نے کہا " نورجہاں فکر کی کوئی بات نہیں کوئی شئے نہیں ٹوٹی "۔

پھر ایک خاص طرح کی دلیری نے میری زندگی میں زور پکڑنا شروع کر دیا۔ اَب تک میں مسیح کے بارے میں کسی کو اپنی دلچسپی بتاتے ہوئے گھبراتی۔ مجھے ڈر تھا کہ لوگ میری ہنسی اُڑائیں گے مجھے ڈر تھا کہ خاندان سے میں قطع تعلق ہو جاؤں گی۔ شاید محمود کا والد اسے مجھ

سے لینے کی کوشش کرے۔ اس خیال سے میں مزید خوف زدہ ہوئی کہ کوئی سر پھرا مذہبی دیوانہ اپنے جوش میں مجھے قتل نہ کر دے۔ پس میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی مجھے مچیل کے گھر دیکھے۔

عورتوں کا وہ گروہ جو اُس پہلی رات مسٹر مچیل کے گھر سے نکلا تھا ابھی تک میرے ذہن پر سوار تھا۔ میرے نوکر جانتے تھے کہ یقیناً میں غیر معمولی واقعات کی زد میں ہوں۔ ان تمام خیالات کے سبب سے میں مسلسل بے چینی کی حالت میں رہتی تھی۔ پتہ نہیں میرے خلاف دباؤ کا زور کب زیادہ ہو جائے۔

مگر میں تین بار خُدا کے جلوؤں کو دیکھنے کے بعد ایک روز حیران کن دلیری سے معمور تھی۔ میرے مسیحی ہونے کا فیصلہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ بائیبل کے الفاظ میں "میں اپنے منہ سے یسوع کا اقرار کر رہی تھی"۔ ایک دن اپنی خواب گاہ کی کھڑکی کے نزدیک کھڑے ہوئے میں اپنے آپ سے ہمکلام ہوئی کہ دیکھیں اُونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

میں اس قدر جلد نتائج کی متوقع نہ تھی۔ ۱۹۶۶ء کرسمس کے جلد ہی بعد میری ملازمہ پریشانی کے عالم میں سیڑھیوں سے نیچے آئی اور مجھے اطلاع دی بیگم صاحبہ! مسز مچیل آپ سے مُلاقات کو آئی ہیں۔ معمول کے مطابق میں کہنے لگی کہ اُسے اندر آنے دو۔ جب میں دروازہ پر اُس کے استقبال کو اُٹھی میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میں نے کہا آپ کی ملاقات میرے لئے باعثِ عزت ہے۔ میں نے بڑی دلیری سے یہ الفاظ کہے۔

مسز مچیل مجھے کھانے کی دعوت دینے آئی تھیں۔ کہنے لگی کہ چند

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

اور لوگ بھی وہاں ہوں گے۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ ان سے ملنا پسند کریں گی۔ اور لوگوں کا سُنتے ہی پُرانی دیواریں پھر سے سر اُٹھانے لگیں۔ یقیناً سینوو نے میری جھجکتی ہوئی نگاہ کو تاڑ لیا ہوگا۔ اس لئے وہ کہنے لگی اُن میں کچھ انگریز ہوں گے اور کچھ امریکن کیا آپ تشریف لائیں گی؟ میں نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

میں حیران تھی کہ اکثر بہت سے مسیحی اپنا مسیحی تجربہ اور اعتقاد دوسروں سے بیان کرنے سے کیوں شرماتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ جن لوگوں سے میری ملاقات مچل کے گھر ہوگی، وہ اپنا تجربہ اور مسیحی عقیدہ بیان کرنے سے نہیں شرمائیں گے۔

اگلے روز میں مچل کے گھر تھی۔ ڈیوڈ مچل اور اُس کی بیگم نے بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا۔ اور اپنے دوستوں سے میرا تعارف کروایا۔ میں اُس وقت ناواقف تھی کہ ان میں سے کچھ لوگ میری زندگی میں عظیم کردار ادا کریں گے۔ میری ملاقات مسٹر اور مسز اولڈ سے ہوئی۔ مسٹر اولڈ ایک سول انجینئر تھا۔ وہ بہت بے تکلف تھے۔ وہ خود انگریز تھے اور ان کی بیگم ماری ایک امریکن نرس تھی۔ وہ بھی بہت ہنس مکھ تھی۔ دیگر لوگ بھی ملنسار تھے۔

میں سب کی توجہ کا مرکز تھی۔ ہر ایک میرے تجربے سُننے کو بے قرار تھا۔ یہ بڑی خاموش ضیافت ہوگی۔ مگر بہت سوال جواب ہوئے میری توقع کے برعکس یہ خاموش ضیافت نہ تھی۔ سب خاموشی سے میرے تجربات سُن رہے تھے حتیٰ کہ بچے بھی خاموشی اور انہماک سے سُن رہے تھے۔ ضیافت کے اختتام پر ڈیوڈ مچل نے اپنی بیگم کے کھانے کو سراہنے کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میری داستان کی روحانی خوراک بہت

رُوح افزا تھی۔ مسٹر اولڈ نے اِس بات میں ہاں مِلائی۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ میں نے آپ کو پہلے دیکھا ہے۔ میں واہ میں رہا کرتا تھا۔ صبح سویرے آپ کے باغ کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے آپ کے پھولوں کو سراہا تھا۔ کبھی کبھار آپ باغیچہ میں ہوتی تھیں مگر میں یہ کہونگا کہ آپ بہت بدل چکی ہیں۔

میں نے یقیناً محسوس کیا کہ میں جانتی ہوں کہ اس سے کیا مراد ہے۔ چند ماہ پہلے کی بلقیس مسکراہٹ سے خالی تھی۔ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مسٹر اولڈ کہنے لگا آپ ایک ایسے بچے کی مانند ہیں جیسے اچانک ایک تحفہ دے دیا گیا ہو۔ اِس تحفہ کو پانے سے میں آپ کے چہرے پر ایک عظیم رُعب دیکھتا ہوں۔ یہ خزانہ ان تمام اشیاء سے بڑھ کر ہے جو آپ کے پاس پہلے تھیں میں اُس کی گفتگو سے خوش تھی۔ میں دوسروں کی گفتگو سے بھی لطف اندوز ہوئی تھی۔ اور میں نے جانا کہ میں دُرست راہ پر ہوں۔ یہ مسیحی ان مسیحیوں سے جن سے میری ملاقات دُوسری ضیافتوں میں ہوئی تھی مختلف تھے۔ شام ہونے سے پہلے ہر شخص اپنی زندگی میں خُدا کے کام کا ذکر کر چکا تھا۔ اچھے کھانے کے ساتھ ساتھ خدا کی حضوری سے حقیقی بھوک مٹ رہی تھی۔ اس طرح کا سماں میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اور میں خواہشمند تھی کہ کاش اِس طرح کی ضیافتیں مسلسل ہوتی رہیں۔

جاتے وقت مسٹر اولڈ نے میری مسیحی رفاقت کی ضرورت کو بتایا اور کہنے لگا کہ کیا آپ اتوار کی شام ہمارے ہاں تشریف لائیں گی؟ اور اس طرح دوسرے مسیحیوں سے میری مسلسل ملاقاتوں کا آغاز ہوا۔ اتوار کی شام ہماری ملاقات اولڈ کے گھر ہوئی۔ ڈرائینگ روم میں

میں نے اُسے باپ کہنے کی جراءت کی

درجن کے قریب لوگ جمع تھے۔ اِن میں صرف دو پاکستانی تھے۔ اور باقی امریکن اور انگریز تھے۔ میری ملاقات چند نئے لوگوں سے بھی ہوئی۔ مثلاً ڈاکٹر اور مسز کرسٹی۔ یہ لمبے قد کا امریکن آنکھوں کا ڈاکٹر تھا۔ اس کی بیوی نرس تھی۔ دونوں لوگ مشن ہسپتال میں کام کرتے تھے۔ ان ملاقاتوں پر ہم گیت گاتے بائیبل پڑھتے اور ایک دوسرے کی ضروریات کے لئے دُعا کرتے تھے بہت جلد یہ میرے ہفتے کی عظیم شامیں بن گئیں۔

پھر ایک اتوار میں کسی سبب سے جانے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہی تھی۔ یہ ایک ہلکی سی بات لگتی تھی۔ مگر اچانک میں بے قرار سی ہونے لگی۔ یہ کیا تھا؟ میں بے قراری کے عالم میں ملازمین کے کاموں کی جانچ پڑتال کرتے ہوئے گھر میں چہل قدمی کرنے لگی۔ اگرچہ ہر چیز درست تھی۔ تو بھی یوں لگتا تھا کہ ہر شئے بے ترتیبی سے رکھی ہوئی ہے۔

میں اپنے کمرے میں گئی اور دُعا کرنے کے لئے دوزانو ہوئی۔

تھوڑی دیر بعد محمود آ گیا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اس قدر دبے پاؤں داخل ہوا کہ مجھے اِس کے آنے کا علم نہ ہو سکا۔ جب تک میں نے اُس کے ننھے ہاتھوں کی لمس محسوس نہ کی۔ اُس نے پوچھا، ممی! آپ ٹھیک ہیں۔ آپ اُداس دکھائی دیتی ہیں۔ میں مُسکرا دی۔ اور اُسے یقین دلایا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ وہ کہنے لگا آپ چلتے ہوئے ارد گرد دیکھتی جاتی تھیں، جیسے آپ نے کچھ کھو دیا ہو۔ پھر وہ اُچھلتے کودتے کمرے سے باہر چلا گیا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ کچھ کھو گیا ہے۔ محمود ٹھیک کہتا تھا اور میں جانتی تھی کہ میں نے کیا کھویا ہے۔ میں نے خدا کی حضوری کا احساس کھو دیا تھا۔ یہ مجھ سے جا چکا تھا۔ کیوں؟ کیا اِس

کا تعلق اولڈ کے گھر میں میرے اُس دُعائیہ میٹنگ پر نہ جانے سے تو نہیں تھا۔ کیا اس کا سبب یہ تو نہیں تھا کہ میں نے رفاقت کی ضرورت کو پیشِ نظر نہیں رکھا تھا۔

اس بات میں کس قدر ضرورت کا احساس تھا۔ جب میں نے کین کو ضرورت کے احساس کے پیشِ نظر فون پر کہا کہ میں آئندہ اتوار ضرور آؤں گی۔ اِس کے ساتھ ہی میری رُوح میں وہ گرمجوشی دوبارہ لوٹ آئی۔ کوئی غیر معمولی بات تو نہ ہوئی مگر اِس رفاقت سے خداوند کی حضوری کا احساس تازہ ہو گیا۔ مسٹر اولڈ کے کہنے کے مطابق مجھے رفاقت کی ضرورت کا سبق مل گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اس وقت تک مسلسل جانے کا تہیہ کر لیا جب تک یسوع خود مجھے نہ جانے کا حکم نہ دے۔ خدا کی قربت میں چلتے ہوئے خدا کے کلام کی بھوک روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ بائیبل کا مطالعہ میری دلچسپی کا مرکز تھا۔ بائیبل میرے لئے ایک زندہ حقیقت تھی۔ بائیبل میرے قدموں کے لئے روشنی اور میرے راہ کے لئے چراغ تھی۔ حق تو یہ تھا کہ بائیبل میرا دلکش عطر تھی۔ یہاں بھی میں نے ایک عجیب بات دیکھی۔

ایک روز محمود اور میں ایک دن کے لئے اُس کی ممی سے ملاقات کو گئے۔ ایک رات پیشتر میں دیر سے سوئی اور تھکاوٹ کے سبب سے میں صبح سویرے اُٹھ کر مطالعہ بائیبل میں ایک گھنٹہ بسر کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ لہٰذا میں نے ریشم سے کہا کہ روانگی سے کچھ دیر پہلے چائے کے وقت پر مجھے جگا دینا۔

تمام شب بے چینی سے کروٹیں لیتے ہوئے بیتی تھی۔ اور مجھے ناخوشگوار خواب آتے رہے تھے۔

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

ریشم کے آنے پر میں تھکی ہوئی تھی۔ دن بھر مایوسی کے بوجھ تلے بیت گیا۔ کیا سبب تھا کہ خداوند چاہتا تھا کہ میں ہر روز بائیبل پڑھوں۔ یہ دوسری بار تھی جب میں نے محسوس کیا کہ میں خداوند کی حضوری کے جلال سے دور جا رہی ہوں۔

مگر اس تجربے نے ایک عجیب سا جذباتی احساس جگا دیا۔ کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ میں پہچانے بغیر ایک اہم سچائی پر بیٹھی ہوں۔ کبھی تو مجھے خدا کی حضوری کا گہرا احساس ہوتا اور کبھی میں اس احساس کو کھو دیتی تھی۔

مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ اُس کی قربت میں رہنے کے لئے میں کیا کر سکتی ہوں۔ میری سوچ ان اوقات پر مرکوز ہوئی۔ جب وہ غیر معمولی طور پر میرے قریب تھا۔ مثلاً میرا خیال ان خوابوں کی طرف گیا اور بعد از دوپہر اس مہک کی طرف جو سردیوں کے موسم میں میرے باغیچہ میں تھی۔ میں نے اس پہلے وقت کے بارے میں سوچا جب میں محل کے گھر گئی تھی۔ اور اس کے بعد کے وقتوں پر غور کیا۔ جب میں بائیبل مسلسل پڑھتی تھی اور اولڈ کے گھر میں اتوار کی دعائیہ عبادتوں پر جاتی تھی۔ غالباً ایسے وقت آئے تھے، جب مجھے معلوم تھا کہ خداوند میرے ساتھ ہے میں نے متضاد اوقات پر بھی غور کیا۔ اُن لمحات پر جب مجھے اُس کی حضوری کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ بائیبل اسے یوں بیان کرتی تھی اور خدا کے پاک روح کو رنجیدہ نہ کرو۔ (افسیوں ۴: ۳۰)

کیا نوکروں کو بُرا بھلا کہتے وقت میں نے یہی نہ کیا تھا؟ مسلسل بائیبل نہ پڑھنے سے میں اپنی روح کو مناسب خوراک نہ دیتی تھی۔ یا پھر اولڈ کے ہاں جانے سے سستی کرتی تھی۔ اس کی رفاقت میں رہنے کی کلید کا ایک جُز

فرمانبرداری تھی۔ جب میں فرمانبردار ہوتی تو میں اس کی حضوری میں رہتی۔ میں نے اپنی بائیبل اٹھائی اور یوحنا کی انجیل میں تلاش کرتے ہوئے یہاں میں اس آیت پر پہنچی

اگر کوئی مجھ سے محبت رکھے تو وہ میرے کلام پر عمل کرے گا۔ اور میرا باپ اُس سے محبت رکھے گا۔ اور ہم اس کے پاس آئیں گے۔ اور اُس کے ساتھ سکونت کریں گے۔ (یوحنا ۱۴:۲۳)

جو میں کہنے کی کوشش کر رہی تھی، بائیبل اِسے یوں بیان کرتی تھی۔ میں یہی کرنے کی سعی کر رہی تھی۔ میں نے دُعا کی کہ اے باپ مجھے فرمانبرداری درکار ہے۔ بائیبل کے بموجب میں تیری خادمہ بننے کی مشتاق ہوں میں تیرے حکم مانوں گی۔ لیکن یہ کوئی قربانی نہیں ہے، کیونکہ اس سے مجھے تیری قُربت ملتی ہے۔ تیری نزدیکی کے حصول کے لئے کچھ کرنا قربانی ہو سکتی ہے۔ میں کبھی خداوند کی آواز بلاواسطہ سننے کی عادی نہیں تھی۔ مگر میں قائل تھی کہ مجھے خداوند کی آواز آرہی ہے۔ خدا کے سوا کون مجھے اپنے خاوند کو معاف کرنے کو کہہ سکتا تھا! مجھے یہ آواز آرہی تھی "بلقیس اپنے خاوند سے پیار کرو، اسے معاف کردو۔

لمحہ بھر کے لئے میں گم سُم بیٹھی رہی۔ عام لوگوں کے لئے خدا کی محبت کو محسوس کرنا ایک الگ بات تھی۔ مگر اِس شخص کو پیار کرنا جس نے مجھے اِس قدر دُکھ دیا تھا بالکل مختلف معاملہ تھا۔

اے باپ یہ میرے بس کی بات نہیں میں نہ تو خالد کے لئے برکت مانگ سکتی ہوں اور نہ اُسے معاف کر سکتی ہوں۔ مجھے یاد آیا کہ کیونکر ایک دفعہ بچگانہ طور پر میں نے خداوند سے دُعا کی کہ میرے خداوند

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

خالد کو کبھی مسیحی نہ ہونے دینا۔ کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ اُس خوشی کو وہ جان سکے جسے میں نے پایا ہے۔ اور اب خدا مجھے اُس شخص کو پیار کرنے کا حکم دے رہا تھا۔ خالد کی سوچ سے ہی میں غصہ سے بھر گئی تھی۔ اور میں نے جلدی سے اسے اپنے ذہن سے نکالنے کی سعی کی۔ "اے خداوند ہو سکتا ہے میں اُسے فراموش کر دوں، کیا یہ کافی ہوگا؟" خداوند کی حضوری کی آنچ ٹھنڈی پڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے پھر کہا خداوند! میں اپنے خاوند کو معاف نہیں کر سکتی۔ مجھ میں ایسا کرنے کی سکت نہیں ہے۔

مجھے خداوند کے الفاظ یاد آئے "میرا جُوا ہلکا اور میرا بوجھ ملائم ہے۔ (متی ۱۱: ۳۰)

میں نے چلاتے ہوئے کہا "میں اسے معاف نہیں کر سکتی"۔ پھر میں نے ان تمام جفاؤں کی لسٹ بنائی جو اس نے میرے ساتھ کی تھیں۔ اِس سے مزید زخموں نے سر اُٹھایا۔ ایسے دُکھ سامنے آئے جن کو میں نے اپنے ذہن میں دفن کر دیا ہوا تھا۔ اور جن کی سوچ بھی مجھے درد میں مبتلا کر دیتی تھی۔ میرے اندر سے نفرت کا چشمہ پھوٹ نکلا۔ اور اب میں محسوس کرتی تھی کہ میں مکمل طور پر خُدا سے جُدا ہوں۔ ایک کھوئے ہوئے بچے کی طرح مارے خوف کے میں چلائی۔ اور جلد ہی معجزانہ طور پر میں خدا کی حضوری کو اپنے کمرے میں محسوس کر سکتی تھی۔ اس کے قدموں پر گرتے ہوئے میں نے اپنی نفرت کا اقرار کیا اور اپنی معاف کرنے کی نااہلیت کو مانا۔

یہ الفاظ میرے ذہن میں پھر تازہ ہوئے۔ "میرا بوجھ ہلکا اور میرا جُوا ملائم ہے"۔ دلیری سے میں نے اپنا بھاری بوجھ اُس

پر ڈال دیا۔ میں نے اپنی نفرت قہر اور دُکھ اُس کے حوالے کر دیئے۔
اچانک میں نے اپنے باطن میں طلوعِ صبح کی سی روشنی کا احساس کیا
سُکھ کا سانس لیتے ہوئے میں تیزی سے اپنے سنگھار میز کی طرف لپکی۔
سُنہری فریم والی تصویر کو اُٹھایا اور خالد کے چہرے پر نگاہ کی۔
میں نے دُعا کی اے باپ! اس نفرت کو لے لے اور میرے خداوند اور
نجات دہندہ یسوع مسیح کے نام سے مجھے خالد کے لئے اپنی محبت سے بھر دے۔
میں کافی دیر تک تصویر پر نگاہیں لگائے کھڑی رہی۔ آہستہ آہستہ میرے باطن
سے منفی احساس مٹنے لگے۔ اور اس کی جگہ ایک غیر متوقع محبت نے لے لی۔
تصویر میں اُس آدمی کے لئے میرے دل میں نیک جذبات نے جنم لیا۔
اور حقیقت میں اپنے خاوند کے لئے بھلائی کے خیالوں میں تھی۔ اے خداوند
اُسے برکت دے۔ اُسے خوشی دے اور وہ جہاں بھی ہے اُسے مسرت
دے۔ اِس کے ساتھ ہی سیاہ بادل میرے دل سے اُٹھ گئے۔ ایک بوجھ
میری رُوح سے ہٹ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اطمینان اور چین سے
معمور ہوں۔ ایک بار اور میں نے محسوس کیا کہ میں اس کے جلال میں رہ رہی
ہوں۔ اور ایک مرتبہ اور میری یہ چاہت تھی کہ میں اُس کی رفاقت کو کبھی بھی
نہ چھوڑوں۔ اس خواہش کو تازہ رکھنے کے لئے میں سیڑھیوں سے نیچے
گئی۔ اور اپنے دونوں ہاتھوں کی پُشت پر صلیب کا نشان بنا لیا۔ بہرصورت
کبھی بھی دیدہ و دانستہ اس کی حضوری سے دور نہیں جاؤں گی۔
مجھے یقین تھا کہ اس کی حضوری میں رہنے کا فن سیکھنے میں مجھے کچھ
وقت درکار ہے۔ مگر یہ تربیت کا وقت تھا جسے میں نے بڑی خوشی
سے قبول کیا۔ اور پھر ایک رات مجھے خوفناک تجربہ ہوا۔

ساتواں باب

پانی اور آگ سے بپتسمہ

۱۹۶۷ء جنوری کی رات میں گہری نیند سوئی ہوئی تھی کہ میرا پلنگ زور زور سے ہلنے لگا، میں پریشانی میں جاگ گئی۔

بھونچال! میرا دل ایک نہ معلوم خوف کی گرفت میں تھا۔ اور اِس کے بعد میں نے اپنے کمرے میں خوفناک شیطانی قوت کا احساس کیا ایک ایسی قوت جو یقیناً شیطانی تھی۔

یکایک مجھے بستر سے گرا دیا گیا۔ جسم میں یا روح میں یہ میں نہیں جانتی۔ لیکن یوں لگا جیسے تند و تیز جھونکے نے ایک تنکے کو اڑا دیا ہو۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ محمود کا چہرہ میرے سامنے آگیا اور میرا دل اس کی حفاظت کے لئے چلّایا۔ جب میری جان کانپ رہی تھی تو مجھے گمان ہوا کہ یقیناً جی نہ سکوں گی۔ ایک خوفناک سی حضوری ایک سیاہ بادل کی مانند مجھ پر چھائی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے آقا کو پکارا اے خداوند یسوع اور اِس کے ساتھ ہی اِس قدر زور زور سے کانپنے لگی جیسے شکار شکاری کی زد میں کانپتا ہے۔ اپنی رُوح میں چلاتے ہوئے خُدا سے دُعا کی کہ اے خدا! کیا میں نے یسوع کو پکارنے میں خطا کی ہے۔ اِس

پر ایک عظیم قوت مجھ میں داخل ہوئی اور میں نے یسوع ، یسوع پکارنا شروع کر دیا۔

اِس پر زور آور شکاری کا زور ٹوٹ گیا۔ میں وہاں پڑے اپنے خداوند کی حمد و ستائش کرتی رہی۔ تاہم کوئی تین بجے صبح کے قریب میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ اور میں سو گئی۔

صبح کے وقت ریشم نے چائے کے وقت مجھے جگایا میں بستر پر دراز ایک سکون محسوس کر رہی تھی۔ جونہی میں نے دُعا میں اپنی آنکھیں بند کیں۔ میں نے اپنے سامنے یسوع مسیح کو کھڑے دیکھا۔ وہ سفید چوغہ اور ارغوانی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ بڑے پیار سے مُسکرائے اور کہنے لگے گھبراؤ نہیں ایسا پھر نہیں ہوگا۔

اِس وقت میں نے محسوس کیا کہ میرا خوفناک تجربہ شیطانی تھا۔ یہ ایک طرح کی آزمائش تھی جو میری بھلائی کے لئے تھی۔ مجھے وہ پکار یاد آئی جو میرے باطن کی گہرائی سے آئی تھی۔ وہ پکار یہ تھی۔ میں اُس کے نام کو یاد کروں گی۔ میں یسوع مسیح کا نام لوں گی۔"

میرا خداوند ابھی تک میرے روبرو کھڑا تھا۔ اُس نے فرمایا "بلقیس وقت آگیا ہے کہ تم پانی سے بپتسمہ لو۔ پانی کا بپتسمہ یہ الفاظ میں نے بڑی صفائی سے سُنے تھے اور جو کچھ میں نے سُنا تھا مجھے پسند نہیں تھا۔

جتنی جلدی ہو سکا، میں نے لباس پہنا ریشم اور نور جہاں کو تلقین کی کہ دوپہر کے کھانے تک مجھے اکیلے چھوڑ دیں۔ سوچ میں گم میں کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ صبح کی ہوا خنک تھی اور باغ میں چشموں سے بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ میں جانتی تھی کہ بپتسمہ کا مفہوم مسلمان پر واضح ہے مگر بپتسمہ کی رسم ایک مختلف بات تھی ایک مُسلمان کے لئے یہ ایک بے خطا نشان

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

ہے کہ ایک شخص نے اسلام ترک کر کے مسیحیت کو قبول کر لیا ہے مسلمانوں کے لئے بپتسمہ ایک ارتداد ہے۔

پس یہاں پر ایک مشکل آزمائش کا مرحلہ تھا۔ نتیجہ عیاں تھا کیا میں یسوع کی فرمانبرداری کروں اور نتیجتاً ایک شودر اور غدار سے بدتر زندگی بسر کروں۔ سب سے پہلے مجھے یقین کرنا تھا کہ میں حقیقت میں خداوند کی پیروی کر رہی ہوں۔ میں اس قدر مضبوط مسیحی نہیں تھی کہ ٹھیک طور پر آوازوں میں امتیاز کر سکوں۔ لہٰذا میں اپنی بائیبل کی طرف لوٹی۔ اور پڑھا کہ کیونکہ یردن میں بذاتِ خود یسوع نے بپتسمہ لیا تھا۔ پھر میں نے رومیوں کے خط پر نگاہ کی جہاں بپتسمہ موت اور زندگی کی اصلاحات میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی پرانا آدمی مر جاتا ہے۔ اور نیا آدمی اپنے تمام گناہوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے جی اُٹھتا ہے سو یہی اُس کا مفہوم تھا۔ اگر یسوع نے بپتسمہ لیا تھا اور بائیبل بپتسمہ کی تلقین کرتی ہے تو بلاشبہ میں فرمانبرداری کروں گی۔

اُسی لمحہ ریشم کو بلانے کے لئے میں نے گھنٹی بجائی۔ میں نے کہا کہ منظور سے کہو کہ کار تیار کرے کیونکہ دوپہر کے کھانے کے بعد میں مسٹر اولڈ سے ملاقات کو جا رہی ہوں۔

تھوڑی دیر بعد میں مسٹر اور مسز اولڈ کے کمرے میں تھی۔ بڑی سادگی سے میں نے انہیں بتایا کہ کیونکہ خداوند نے مجھے بپتسمہ لینے کو کہا ہے۔ وہ اپنی بھنویں چڑھائے مجھے تکتا رہا۔ شاید وہ میرے ارادے کی گہرائی کو ناپنے کی کوشش کر تا رہا تھا۔ پھر مسٹر اولڈ آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہنے لگا "بلقیس" معاملہ نہایت سنجیدہ ہے۔ کیا آپ نتائج سے آگاہ ہیں" "ہاں!" میں نے جواب دیا۔ اور اِس سے پہلے کہ میں

کچھ اور کہوں دھیری آواز میں بات کاٹتے ہوئے مسٹر اولڈ کہنے لگا، بلقیس! کیا آپ اپنی خاندانی مرتبت سے دستبردار ہونا برداشت کریں گی۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس کے بعد آپ بیگم شیخ نہیں کہلائیں گی جو کہ ایک باعزت زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے بعد یہاں رہنے والے مسیحیوں سے آپ کا تعلق ہوگا؟ جواباً میں نے کہا میں اسے خوب سمجھتی ہوں۔ اُس کے الفاظ اور بھی سخت تھے۔ میں نے اُسے ایسی نگاہوں سے دیکھا جس میں مصمم ارادہ تھا۔ بات جاری رکھتے ہوئے وہ کہنے لگا اور کیا آپ جانتی ہیں کہ محمود کا باپ بڑی آسانی سے اُسے آپ سے لے سکتا ہے وہ آپ پر بڑی آسانی سے غیر ذمہ دار سرپرست کا لیبل لگا سکتا ہے"۔

میرے دل پر گویا کسی نے ڈنک مار دیا تھا۔ میں اُس کے بارے میں فکرمند ہوئی تھی۔ مسٹر اولڈ کے منہ سے سُن کر میرے وسوسے اور مضبوط ہو گئے۔ ناتوانی سے میں نے کہا مجھے معلوم ہے جانتی ہوں کہ لوگوں کو یہ گمان ہوگا کہ میں ایک جرم کا ارتکاب کر رہی ہوں۔ لیکن میں بپتسمہ لینا چاہتی ہوں۔ مجھے خدا کی فرمانبرداری لازم ہے۔ ہماری گفتگو مسٹر مچل کی غیر متوقع آمد سے ادھوری رہ گئی۔ مسٹر اولڈ نے فوراً انہیں بتایا کہ ہمیں ایک اہم معاملہ پر گفتگو کرنا ہے۔ وہ کہنے لگا "بلقیس بپتسمہ لینا چاہتی ہے"۔ تھوڑی دیر تک کمرے میں سکوت طاری رہا۔

ڈیوڈ کہنے لگا مگر ہمارے ہاں تو کوئی حوض نہیں ہے۔ ماری نے پوچھا! پشاور کے گرجا گھر میں جو حوض ہے اُس کے متعلق کیا خیال ہے۔ پشاور کا نام سن کر میرا دل کانپ گیا۔ پشاور ایسا

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرات کی

شہر ہے جس میں قدامت پرست مسلمان بستے ہیں۔ اور جو جوش میں ہوش کا خیال نہیں رکھتے۔ میں نے سوچا کہ یقیناً راز فاش ہو جائے گا۔ گھنٹہ بھر میں سارے گاؤں کو خبر ہو جائے گی۔ ہمارے پٹ ورجانے کا سارا انتظام مسٹر اولڈ پر چھوڑ دیا گیا۔ ایک دو روز میں پادری ہمیں اس کی خبر کرے گا۔

اُسی شام میرا ٹیلیفون آیا۔ یہ میرے چچا فتح کی طرف سے تھا۔ میں اس بزرگ یا عزت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ وہ ہمیشہ میری مذہبی فلاح میں بہت دلچسپی دکھاتا تھا۔ "بلقیس" چچا کی کرخت آواز نے مجھے پریشان کر دیا۔ ہاں چچا جان!" کیا یہ سچ ہے کہ تم بائیبل کا مطالعہ کر رہی ہو" "ہاں" میں حیران تھی کہ اُسے اس کا کیونکر علم ہوا۔ چچا فتح کھنکھارتے ہوئے کہنے لگے کہ ان مسیحیوں میں سے کسی کے ساتھ کبھی بائیبل سے متعلق بات نہ کرنا۔ تم جانتی ہو کہ یہ کس قدر بحث کرتے ہیں۔ ان کی بحث اکثر پریشانی کا سبب ہوتی ہے۔ میری آواز دباتے ہوئے اور زور دیتے ہوئے کہنے لگے۔ اُن میں کسی کو کبھی اپنے گھر میں مجھ سے مشورہ کئے بغیر آنے کی دعوت نہ دینا۔ اگر تم یہ نہ کرو تو یاد رکھو کہ خاندان میں سے کوئی تمہاری حامی نہ بھرے گا۔ انکل فتح کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اور جوں ہی وہ سانس لینے کے لئے خاموش ہوئے میں بول اُٹھی

"چچا جی سُنیئے"

فون پر دوسری طرف خاموشی تھی۔

میں نے کہا چچا آپ کو یاد ہوگا کہ میرے گھر میں دعوت کے بغیر کبھی کوئی داخل نہیں ہوا۔ مجھے اُمید ہے کہ میرا چچا اسے یاد رکھے گا میں اس بات کے لئے مشہور تھی کہ جو ملاقات کے وقت کا پہلے اہتمام نہ کرے میں اُس سے ملنے کے لئے رضامند نہ ہوتی تھی۔ فیصلہ کن انداز میں میں نے کہا جسے میں چاہوں گی اس سے میں ملاقات کروں گی خداحافظ فون میرے ہاتھ میں ہی تھا۔ میرے خاندان کی جانب سے کیا یہ آنے والی باتوں کا شگون تھا۔ اگرچہ فتح فقط یہ سننے سے بے قرار تھا کہ میں بائیبل پڑھتی ہوں، تو باقی خاندان کا میرے بپتسمہ کے بارے میں سُن کر کیا حال ہوگا۔

میں اِس پر غور نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسی وقت بپتسمہ لینے کی خواہش اور شدید ہوگئی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ اپنے تمام رشتہ داروں کے دباؤ کا مقابلہ کرسکوں گی یا نہیں۔ مسٹر اولڈ کی طرف سے کوئی پیغام نہیں آیا تھا۔

اگلی صبح بائیبل میں میں حبشی خوجہ کی کہانی پڑھ رہی تھی جسے فلپس نے خدا کا پیغام دیا تھا۔ چلتے چلتے پانی کے پاس پہنچنے پر حبشی خوجہ نے بپتسمہ لیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ خداوند مجھے بار بار کہہ رہا ہو کہ ابھی بپتسمہ لو۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر میں اور انتظار کروں گی تو کوئی رکاوٹ پیدا ہوسکتی ہے۔ میں جلدی تیار ہوکر مسٹر مچل کے گھر پہنچ گئی۔ دروازے پر ہی کھڑے میں نے مسٹر مچل سے پوچھا کہ کیا پادری سے کوئی جواب آیا ہے؟ وہ کہنے لگا نہیں! میں نے کہا کیا آپ مجھے یہاں بپتسمہ نہیں دے سکتے؟" آج! اسی وقت" مسٹر مچل کہنے لگا کہ اس قدر بڑے فیصلے کے لئے ہم جلد بازی نہیں کرسکتے۔

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

میں نے اُسے بتایا کہ کیونکہ خداوند چاہتا ہے کہ میں جلد از جلد بپتسمہ لوں۔ اور میں کسی رکاوٹ کے عمل میں آنے سے پہلے خداوند کی فرمانبرداری کرنا چاہتی ہوں۔

بے بسی کی حالت میں ڈیوڈ نے اپنے ہاتھ پھیلائے اپنی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگا کہ میں ضرور ہے کہ سینوو کو بعد از دوپہر ایبٹ آباد لے کر جاؤں اور پھر مجھے صبر کرنے کی تلقین کرنے لگا۔ اور کہا "مجھے یقین ہے کہ کل ہمیں پشاور سے خبر آجائے گی۔ میں مسٹر اولڈ کے گھر گئی اور جونہی آولڈ اور ماری، میری ملاقات کو نکلے میں نے چلاتے ہوئے اُن سے کہا کیا کوئی راہ ہے کہ فوری طور پہ میں بپتسمہ لے لوں۔ مجھے بازو سے پکڑے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے مسٹر اور مسز اولڈ کہنے لگے، ہم نے اپنے پادری سے پوچھا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس سارے معاملے کو سیشن میں سے گزرنا ہوگا۔ سیشن؟ پریشانی کی حالت میں میں نے پوچھا وہ کیا ہے۔ اُس نے بیان کیا کہ اس کا پادری مجھے بپتسمہ دینے پہ رضامند ہے۔ مگر اُسے کلیسیا کے بزرگوں کی منظوری لینا لازمی ہے۔ اس نے مزید کہا کہ اس میں کئی دن لگ سکتے ہیں۔ اور اسی اثنا، میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میرا ذہن تمام ممکنات پر تیزی سے غور کر رہا تھا۔ پھر مسٹر اولڈ نے مجھے عجیب بات بتائی۔ آدھی رات کے وقت اُس نے ایک شخص کی آواز سُنی جس نے اُس سے کہا کہ بائیبل میں ۶۵۴ صفحہ کو کھولو۔ اُس نے سوچا کہ بائیبل کا حوالہ دینے کا کس قدر عجیب انداز ہے۔ یہ ایوب کا ۱۳ : ۱۴ باب تھا۔ اور اس حوالہ میں یہ آیات تھیں۔ اُس نے وہ آیات پڑھیں جو اُس کے لئے برکت کا سبب تھیں اور جن کا میرے لئے مفہوم عیاں تھا، یوں

لکھا تھا:

"میں اپنا ہی گوشت اپنے دانتوں سے کیوں چباؤں
اور اپنی جان اپنی ہتھیلی پر کیوں رکھوں؟ دیکھو وہ
مجھے قتل کرے گا میں انتظار نہیں کروں گا۔ بہرحال
میں اپنی راہوں کی تائید اس کے حضور کروں گا۔"

میں سوچ میں تھی کہ کیا میں اس کے لئے بھی مستعد ہوں۔ کیا میرا بھروسہ اس قدر قوی ہے۔ میں کھڑے ہوتے اور مسٹر اولڈ کا بازو تھامے ہوئے کہا مجھے ابھی پانی کا بپتسمہ دو۔ اور پھر اگر چہ وہ مجھے قتل بھی کر دیں میں اس کے لئے تیار ہوں۔ اپنے خداوند کے ساتھ آسمان میں رہنا میرے لئے بہتر ہے۔

بے بسی کی حالت میں مسٹر اولڈ کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے اپنی پریشانی کے بارے میں بتایا اور اس کا بھی تذکرہ کیا کہ خداوند نے کہا ہے کہ میں ابھی بپتسمہ لوں۔ اس معاملے میں کیا آپ میری مدد کریں گے یا نہیں؟ مسٹر اولڈ ٹیک لگا کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے بھورے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔ ماری کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا "کیوں نہ ہم مچل کے گھر چلیں"۔ اور دیکھیں کہ ہم کیا کچھ کر سکتے ہیں! واہ کی بل کھاتی ہوئی گلیوں میں سے ہم واپس مسٹر مچل کے گھر گئے کچھ دیر تک مچل کے دعائیہ کمرے میں ہم خاموش بیٹھے رہے۔ پھر مسٹر اولڈ سنجیدگی سے ہم سے مخاطب ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ ہم سب مانتے ہیں کہ اب تک خدا بلقیس کی غیر معمولی طور پر راہنمائی کرتا رہا ہے۔ اور اگر وہ اپنے بپتسمہ کی اہمیت پر زور دے رہی ہے تو یہ بھی خدا کی طرف سے ہے۔ اچھا ہے کہ ہم اس میں رکاوٹ نہ بنیں

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرات کی

مسٹر مچل کی جانب متوجہ ہو کر بولا " آپ ایبٹ آباد تو جا ہی رہے ہیں۔ کیوں نہ ماری اور بلقیس کو اپنے ہمراہ لیتے ہوئے وہاں آپ سے ملیں۔ اور بعد از دوپہر بلقیس کے بپتسمہ کا انتظام کریں پشاور جانے کا پروگرام ختم کر دیں۔

اچانک یوں لگتا تھا کہ یہ فیصلہ دُرست ہے۔ بس ہم سب نے تیاری شروع کر دی۔ میں جلدی سے گھر گئی ریشم سے کہا کہ وہ جلدی سے کپڑوں کا ایک جوڑا پیک کر دے۔ کیونکہ مسٹر اولڈ نے کہا تھا کہ اُس کی ضرورت ہوگی۔ ان سب باتوں کے دوران میں بے چینی سی محسوس کر رہی تھی۔ خدا سے دوری کا احساس شدید ہو گیا۔ خدا نے صفائی سے مجھے فوری طور پر بپتسمہ کی تلقین کی تھی۔ جسے میں طوالت میں ڈال رہی تھی۔ اپنی کوشش کے باوجود بھی فوری طور پر بپتسمہ لینے کے خیال کو میں ذہن سے نہ نکال سکی۔

جب کوئی اور چارہ نہ رہا تو میں نے خداوند سے پوچھا کہ کیا میرا اسی وقت بپتسمہ لینا دُرست ہے؟ اس طرح ۲۴ جنوری ۱۹۶۷ء کو بہت غیر معمولی بپتسمہ کا آغاز ہوا۔ میں نے دوبارہ ریشم کو بُلا کر ٹب پانی سے بھرنے کو کہا اُس نے میرے حکم کی فرمانبرداری کی تو ضرور مگر وہ کچھ پریشان تھی کیونکہ یہ میرے غسل کا وقت نہیں تھا۔

ریشم نے مجھے ٹب بھر جانے کی اطلاع دی اور میں نے اُسے کہا کہ تم جا سکتی ہو۔ میرا یہ عمل علم الٰہیات کی روشنی میں غلط ہو سکتا تھا مگر میرے سامنے علم الٰہیات کی اصطلاحات نہیں تھیں۔ پُرزور فرمان کی بجا آوری کی کوششیں کر رہی تھی۔ جس کے پیچھے خدا کا کلام تھا۔ ضرور تھا کہ میں ابھی بپتسمہ لوں۔ اور اگرچہ یہ علم الٰہیات

کے اصولوں کے خلاف تھا۔ تو بھی بعد از دوپہر تک انتظار کرنے کے لئے میں تیار نہیں تھی۔

پس چونکہ اس دُنیا میں سب خواہشات سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میں اپنے خداوند کی حضوری میں رہوں اور اس خواہش کو صرف فرمانبرداری سے پُورا کیا جاسکتا تھا۔ میں غسل خانے کی طرف چلی اور گہرے ٹب میں اُتر گئی۔ بیٹھے ہوئے پانی میرے کندھوں تک آرہا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ اپنے سر پر رکھتے ہوئے اُونچی آواز میں کہا بلقیس میں تمہیں باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام پر بپتسمہ دیتی ہوں۔ میں نے اپنے سر کو ہاتھ سے نیچے دبایا اور اپنے سارے بدن کو پانی کے اندر مکمل طور پر ڈوب جانے دیا۔ خداوند کی تعریف کرتی ہوئی میں پانی سے اُٹھی۔ اے باپ تیرا شکر ہو میں کس قدر خوش نصیب ہوں میں جانتی تھی کہ میرے گناہ دُھل گئے ہیں اور میں خداوند کی قبول نظر ہوں۔ نہ ریشم نے اس کی بابت پوچھا اور نہ ہی میں نے بیان کرنے کی کوشش کی۔ چند منٹ میں میں لباس پہن کر بپتسمہ لینے کے لئے ایبٹ آباد جانے کے لئے اولڈ کا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے اُس جگہ کے ماحول میں علم الٰہی کا علم نہیں تھا۔ مجھے تو بس اپنے مقصد سے غرض تھی۔ ان مسیحی دوستوں نے میری مدد کرنے میں میرا بڑا خیال رکھا تھا۔ میرے سبب سے انہیں بہت کچھ کرنا پڑا تھا۔ اور میں بات کو پیچیدہ کرنے سے گریزاں تھی۔ اگرچہ میرے دل سے یہ آواز آرہی تھی کہ میں خدا کی فرمانبرداری کر چکی ہوں تو بھی میں بپتسمہ کے لئے چلی گئی۔ میں نے بائیبل پڑھنے کی کوشش کی۔ مگر میری روح اس قدر مسرور تھی کہ میں اپنی پوری توجہ نہ

میں نے اُسے باپ کہنے کی جراءت کی

دے سکی۔ میں خداوند کی نزدیکی میں اسی طرح تھی جس طرح اُس کا فرمانبجا لانے سے میں پہلے ہوا کرتی تھی۔ اور اُس کے حکم بائیبل میں عیاں تھے۔

ریشم نے مجھے مسٹر اور مسز اولڈ کی آمد کی اطلاع دی۔ میں نے محمود سے کہا کہ دن کا باقی حصّہ میں گھر پر نہیں ہوں گی۔ میں نے اُسے نہ بتایا کہ کیوں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ اِن باتوں میں اُلجھے۔ اس کے بعد میں مسٹر اور مسز اولڈ سے جا ملی۔

ایبٹ آباد کا سفر دو گھنٹے کا تھا۔ سڑک کی دونوں طرف صنوبر کے درخت تھے۔ واہ میں میں نے اپنے بپتسمہ کا ذکر نہ کیا۔ اور موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ مجھے وہ وقت یاد آئے جب سامان سے لدی ہوئی گاڑیوں کے ساتھ اِس سڑک پر میں سفر کیا کرتی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے مجھے گمان ہوا کہ میں پُرانی روایات سے بے وفائی کر رہی ہوں۔ منزلِ مقصود پر پہنچنے پر مسٹر اینڈ مسز مچل اور کینیڈا کے ایک ڈاکٹر بوب اور اُن کی اہلیہ جو ہمارے مہمان نواز تھے، ہمارے منتظر تھے۔ ان کے ہمراہ ایک پاکستانی آدمی بھی کھڑا تھا۔ مسز مچل کہنے لگیں کہ یہ شخص پادری بہادر ہیں جو آپ کو بپتسمہ دیں گے۔ دیگر حضرات میں ایک پاکستانی پادری صاحب اور ایک ڈاکٹر تھا۔ مسز مچل کہنے لگی " بلقیس! یہ ایک عظیم گواہی ہے۔ شاید آپ کے سبب سے بہت سے مسیحی ایک دوسرے کے قریب آجائیں کیونکہ پاکستان میں شاید پہلی بار مختلف گروہوں کے لوگ اکٹھے بپتسمہ پر آئے ہیں۔

ہر ایک کے چہرے پر خوشی تھی۔ دروازے بند تھے۔ اور پردے گرے ہوئے تھے اور میں تصور کر سکتی تھی کہ کس طرح پہلی صدی میں

مسیحی روم کی حکومت کے زیرِ اکثر غاروں میں چھُپ کر بپتسمہ لیتے تھے۔ بپتسمہ کی تیاری کے لئے میں نے چاروں طرف نگاہ کی اور پوچھا کہ حوض کہاں ہے؟ مجھے پتہ چلا کہ حوض نہیں ہے۔ مسٹر اولڈ نے کہا کہ مجھے چھینٹے کا بپتسمہ دیں گے۔ میں نے کہا مگر یسُوع نے تو یردن میں غوطے کا بپتسمہ لیا تھا۔

اِس مقام پر پہنچنے سے پہلے ہم ایک دریا کے پُل پر سے گزرے تھے۔ میں نے کہا آپ مجھے دریا پر واپس کیوں نہیں لے جاتے۔ لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ سخت سردی ہے۔ اور دوسروں کو بھی میرے ساتھ پانی میں اُترنا پڑے گا۔ اس لئے میں نے اس پر زور نہ دیا۔ خاص طور پر اس لئے کیونکہ مجھے یقین تھا کہ میں اُس مقدس حکم کی فرمانبرداری کر چکی ہوں۔ شاید اِسی لئے مجھے دوبارہ چھٹے کا بپتسمہ دیا گیا۔ جب مجھ پر پانی چھڑکا جا رہا تھا تو مجھے خیال آیا کہ خداوند ان کی اس حرکت پر یقیناً مُسکرا رہا ہوگا۔ رسم کے بعد جو میں نے نگاہ کی تو دیکھا کہ کمرے میں ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ یقیناً یہ رونا دھونا میرے لئے حوصلہ افزا نہیں ہے۔ خوشی سے میرا نام پُکارتے ہوئے مسز مچل مجھ سے بغل گیر ہو گئی۔ جذبات کے سبب سے وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔

دوسروں میں سے ہر ایک نے مجھے مُبارکباد دی۔ خدا کی تعریف میں ایک مزمور گا کر اور بائیبل مقدس سے کچھ پڑھ کر ہم واپسی کے لئے تیار تھے۔ سفر خاموشی سے کٹا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں اپنے خاندان کے لوگوں میں ہوں۔ آنسوؤں سے ایک دُوسرے کو خدا حافظ کہہ کر ہم ایک دُوسرے سے جُدا ہُوئے۔

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرات کی

جونہی میں دروازہ میں سے اندر آئی، تمام سکون درہم برہم ہوگیا۔ بڑی پریشانی میں چوکیدار میری طرف دوڑا آیا۔ اور بولا، بیگم صاحبہ! آپ کا خاندان آپ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ وہ کہتے تھے آپ کا مسیحیوں سے میل جول ہے۔ میں نے اپنا ہاتھ اُٹھاتے ہوئے اُسے چُپ رہنے کو کہا۔ آہستگی سے میں نے پوچھا" کون کون آیا تھا۔ چوکیدار نے اُن سب کے نام لئے جو اُس روز میرے گھر آئے تھے۔ میں ایک نئی پریشانی میں مُبتلا ہوگئی۔ یہ میرے گھر کے بزرگ لوگ تھے۔ یعنی میرے چچا چچی۔ ماموں مامی اور میرے چچازاد بڑے بھائی۔ اور یہ لوگ میرے گھر میں اُسی وقت گروپ کی صورت میں تشریف لاتے تھے، جب کوئی اہم معاملہ درپیش ہو۔ میرا دل ڈوب گیا۔ اس رات میں نے محمود کے ساتھ کھانا کھایا۔ میری کوشش تھی کہ اُسے میرے وسوسوں کا علم نہ ہو۔ اُس کے سونے کے بعد میں اپنے کمرے میں آئی۔ سردیوں کی اس رات میں چاند کی روشنی میں میں صفائی سے اپنے بائیسچہ کو دیکھ سکتی تھی۔ جس سے مجھے بڑی اُلفت تھی۔ اپنے راحت کدہ سے مجھے بہت اُنس تھا۔

اَب کیا میں اپنے گھر میں بھی رہنے کی مجاز ہوں گی یا نہیں؟ یہ ایک عجیب خیال تھا۔ کیونکہ ہمیشہ خاندان کی حفاظت اور وقار اس گھر میں میرا سرمایہ تھا۔ بلاشُبہ میں نے محسوس کیا کہ یہ خیال گویا ایک نبوت ہے۔ وہ قوتیں جو میرے خلاف صف آرا تھیں اور جنہوں نے اپنے آپ کو پہلے ہی سے میرے خاندان میں سے ظاہر ہونا شروع کر دیا تھا۔ میں اُنہیں جانتی تھی۔ اگر وہ سب یکایک میری مخالفت پر اُتر آئیں تو کیا ہوگا؟ یقیناً اسی سبب سے خداوند میرے فوری بپتسمہ پر زور دے

رہا تھا۔ وہ مجھے جانتا تھا کہ میں کہاں سب سے زیادہ غیر محفوظ ہوں۔ میں کھڑکی میں کھڑی دیکھتی رہی۔ جھومتے ہوئے درختوں کے سائے میرے دریچوں پر پڑ رہے تھے۔ میں نے دُعا کی۔ "اے خداوند میرے تمام رشتہ داروں کو اکٹھے میرے گھر آنے سے باز رکھنا۔ میری منّت ہے کہ وہ ایک ایک کر کے آئیں۔

جونہی میں نے یہ الفاظ ختم کئے دروازے پر دستک ہوئی۔ سیڑھیوں کے نیچے ملازمہ ایک پیکٹ ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔ کہنے لگی یہ ابھی ابھی موصول ہوا ہے۔ جلدی سے میں نے پیکٹ کھولا۔ اس میں بائیبل تھی۔ باہر کے صفحے پر لکھا ہوا تھا "ہماری پیاری بہن کے لئے اُس کی سالگرہ پر" نیچے مسٹر اور مسز اولڈ کے دستخط تھے۔ خدا کا ایسے اچھے دوستوں کے لئے شکر کرتے ہوئے میں نے اِسے سینے سے لگا لیا۔ پھر میں نے اُسے کھولا اور میری توجہ ایک صفحہ پر جم گئی جس پر یہ الفاظ میرے سامنے عیاں تھے۔ میں اُنہیں تتّر بتّر کر دوں گا اُس لمحہ اِن الفاظ کا مفہوم میرے لئے ایک بھید تھا۔

آٹھواں باب

"کیا میں محفوظ تھی"؟

اگلی صبح اُٹھنے پر میں ان خیالات میں تھی۔ آج دوبارہ خاندان کے لوگ آئیں گے۔ یا تو گروپ کی صورت میں یا ایک وقت میں ایک۔ بہرحال میں ان کا سامنا کرنے سے ہراساں نہ تھی۔ میں آنے والے الزامات قہر کی ڈانٹ ڈپٹ، اور دھمکیوں سے خوف زدہ تھی۔

علاوہ ازیں اُنہیں ضرر پہنچانے سے مجھے نفرت تھی۔ مجھے پورا یقین نہیں تھا کہ خدا میری درخواست کے مطابق کرے گا۔ میں نے ریشم سے کہا کہ میری سب سے نفیس ساڑھی لاؤ۔ میں نے سب سے دلکش ساڑی پہن لی۔ چوکیدار کو حکم دیا کہ آج میں ہر ملاقاتی کو خوشی سے ملوں گی۔ اور پھر میں ڈرائینگ روم کی سمت چلی گئی۔ وہاں میں سفید سلک کشن والی کرسی پر بیٹھ کر مطالعہ کرنے لگی۔ محمود میرے پاس اپنے کھلونوں کے ساتھ قالین پر کھیل رہا تھا۔ دھیرے دھیرے وقت گزرتا گیا۔ یہاں تک کہ دوپہر ہوگئی۔ میں نے سوچا، یوں لگتا ہے کہ اُن کا مجھے ملنے کا پروگرام بعد از دوپہر ہے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد محمود سونے کے لئے چلا گیا اور میں انتظار کرتی رہی۔

آخر کار تین بجے میں نے باہر ایک کار کے رُکنے کی آواز سُنی۔ میں سنبھل کر بیٹھ گئی۔ جب کار واپس چلی گئی تو میں نے ملازموں سے پوچھا کہ کون تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ کوئی چیزیں چھوڑنے آیا تھا۔

شام ہو رہی تھی۔ ساڑھے سات بجے فون کی گھنٹی بجی۔ مسز اولڈ فون پر تھیں اُن کی آواز سے لگتا تھا کہ وہ فکرمند ہیں۔ میرے رشتہ داروں کی کل کی یلغار سے ظاہر تھا کہ میرے مسیحی ہونے کی خبر یقیناً پہلے ہی پھیل چکی ہے۔ مسز اولڈ نے میری خیریت پوچھنے کے بعد اپنی فکرمندی کا اظہار کیا۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ میں بخیریت ہوں۔ اور پھر اُن کی فکرمندی کا سبب معلوم کرنے کے لئے ان کے ہاں جانے کے لئے تیار ہو گئی میرا خیال تھا کہ اب خاندان میں سے کوئی ملنے نہیں آئے گا۔ یہ عجیب بات تھی کہ دن بھر نہ تو ان کی طرف سے فون آیا اور نہ وہ خود آئے۔

میں مسیحی خاندان سے یقین دہانی کرنا چاہتی تھی کہ آخر ہوا کیا ہے مسز اولڈ نے اِس قدر رازدارانہ طور پر فون کیوں کیا تھا؟ میں کار پر مسٹر اولڈ کے گھر گئی اور یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ گھر میں مکمل تاریکی تھی۔

پھر بالکل غیر متوقع طور پر میں چوکنی ہو گئی۔ اُس گیٹ پر کھڑے جو اُن کے صحن کی طرف جاتا تھا شدید خوف کی گرفت میں تھی۔ صحن کے تاریک کونوں میں سے تاریک خیالات میرے ذہن میں آ رہے تھے۔ یقیناً رات کے وقت اکیلے آنے میں میں نے بے وقوفی کی ہے۔ میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ میں واپس لوٹنے کے لئے مُڑی۔ میں خوف سے دوڑنے ہی والی تھی کہ میں رُک گئی نہیں! مجھے یُوں نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر میں خدا کی بادشاہی میں ہوں تو بادشاہ کی حفاظت میں ہونا میرا حق ہے۔ خوفزدہ تاریکی میں کھڑے ابھی تک میں بہت ڈری ہوئی تھی۔ میں نے جرأت

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

کے ساتھ اپنے آپ کو واپس بادشاہوں کے بادشاہ کے ہاتھ میں دینا چاہا۔ میں نے بار بار یسوع یسوع پکارنا شروع کر دیا۔ یکایک خوف کے بندھن ٹوٹ گئے۔ اُس کے آتے ہی خوف کافور ہو گیا۔ میں آزاد تھی۔

اب مُسکراتے ہوئے میں مسٹر اولڈ کے گھر کی طرف بڑھی۔ چند قدموں پر گرے ہوئے پتّوں کے درمیان میں سے میں نے تھوڑی سی روشنی دیکھی۔ میں نے دستک دی۔ آہستہ سے دروازہ کھُلا۔ میرے سامنے مسز اولڈ کھڑی تھیں۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو اُس نے سُکھ کا سانس لیا۔ اور مجھے اندر کھینچتے ہوئے مجھ سے بغل گیر ہو گئیں اُس نے مسٹر اولڈ کو آواز دی ایک لمحہ میں وہ آ پہنچا۔ اس کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے "اے خدا تیرا شکر ہو" ہم آپ کے لئے فکر مند تھے۔ مسٹر اولڈ نے مجھے بتایا کہ میرے بپتسمہ کے موقع پر پاکستانی پادری میری حفاظت کے بارے میں بہت فکر مند تھا۔ اور اس کا کہنا تھا کہ آپ کو اکیلے چھوڑنے میں ہم نے غلطی کی ہے۔ اپنے خوف کو دبائے ہوئے میں ہنس دی۔ اور کہنے لگی "تو اسی سبب سے ٹیلیفون پر آپ اس قدر فکر مند تھیں۔ مجھے توقع ہے کہ جلد ہی میرے مسیحی ہونے کی خبر ملک بھر میں پھیل جائے گی۔

بہر صورت میں آپ کی شکر گذار ہوں۔ ابھی تک تو کچھ ہوا نہیں یہاں تک کہ میرے خاندان نے بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ اور آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میں اپنی دُعا کے جواب کے لئے کس قدر شکر گذار ہوں۔ مسٹر اولڈ کے کہنے پر ہم سب دُعا کے لئے ان کے کمرے میں آ گئے۔ ہم نے گزشتہ دنوں کی حفاظت کے لئے خدا کا شکر کیا اور آئندہ ایام کو اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

میں خوشی خوشی گھر لوٹ آئی۔ خوف کے روبرو میں نے یسوع کے نام کی قدرت کو دیکھا تھا۔ نوکروں نے کہا کہ شام کو کوئی ٹیلیفون نہیں آیا تھا۔ سونے کی تیاری کرتے وقت میں نے سوچا کہ دیکھو کل کیا ہوتا ہے۔ پھر دن بھر ڈرائنگ روم میں منتظر رہی۔ یہ وقت دعا کرنے سوچ و بچار کرنے اور مطالعہ کرنے میں بسر کیا۔ کسی سے کوئی پیغام نہ آیا۔ میں اس سبب سے حیران تھی۔ نوکروں سے پوچھ گچھ کرنے پر معلوم ہوا کہ تمام افراد عجیب طور پر مصروف ہو گئے ہیں۔ میری دعا کے جواب اور اپنے وعدہ کے مطابق خداوند نے سب کو تتر بتر کر دیا تھا۔ میں اپنے باطن میں خداوند کی خوشی کو محسوس کر رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے خاندان کے لوگ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں گے اور ہو سکتا ہے کہ ایک ایک کر کے آئیں گے۔

اور اسی طرح ہوا۔ سب سے پہلے میری آنٹی تشریف لائیں۔ اُن کی عمر کوئی ستر برس کی تھی۔ میں اُن کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی۔ میرا محبت اور بھروسے میں ان سے قریبی تعلق تھا۔ اس دفعہ اُن کا چہرہ بہت اُداس تھا۔ تھوڑی دیر ہم نے عام گفتگو کی۔ بالآخر وہ اپنی ملاقات کے اصلی مدعا کی طرف آئی۔ گلہ صاف کرتے ہوئے قدرے تردد سے پوچھنے لگیں بلقیس میں نے سنا ہے کہ تم مسیحی بن رہی ہو۔ کیا یہ سچ ہے؟ جواب میں میں محض مسکرائی۔ بے قراری سے اُنہوں نے اپنی کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا "مجھے گمان تھا کہ لوگ آپ کے بارے میں جھوٹی افواہیں پھیلا رہے ہیں۔ اُس نے اپنی نگاہیں میری طرف لگائیں جن میں توقع تھی کہ میں کہدوں کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ میں نے کہا "آنٹی آمنہ! یہ سچ ہے کہ میں نے مسیح کو اپنی

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرات کی

زندگی دے دی ہے۔ میں نے بپتسمہ بھی لے لیا ہے۔ اب میں مسیحی ہوں"۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لئے اور چلاّتے ہوئے بولی کہ یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ ایک لمحہ کے لئے وہ ساکت بیٹھی رہی اور کچھ نہ کہہ سکی۔ پھر آہستگی سے اپنی شال اوڑھی اور بڑے قہر میں میرے گھر سے رخصت ہوگئی۔

میں بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔ مگر میں نے خداوند سے دُعا کی کہ خداوند انہیں ہر نقصان سے بچا کر صراط المستقیم دکھائے۔ میں نے اپنے خاندان کے لئے خیر و برکت کی دُعا کی۔ میں نے خداوند کا شکر بھی ادا کیا۔ میں نے دُعا کی کہ کاش میرا خاندان مجھے صحیح طور پر سمجھ جائے۔

اگلے روز پھر یہی دُعا کی۔ اِس بار یہ اسلم کے لئے تھی۔ اسلم میرا چچازاد بڑا بھائی تھا۔ جو مجھے ملنے آیا تھا۔ یہ ایک وکیل تھا اور واہ سے کوئی ۴۵ میل کے فاصلے پر رہتا تھا۔ میرے چچازاد بھائی کی حیثیت سے کردار میں اسے بہت سی باتیں ورثہ میں میرے باپ سے ملی تھیں۔ وہی گرم جوش مُسکراہٹ اور مذاحیہ گفتگو میں اسلم کو پسند کرتی تھی۔ اُس کے رویّہ سے مجھے یقین تھا کہ اُس نے میرے معاملہ کی تمام تفصیلات نہیں سُنی تھیں۔ ہم نے چند خوشگوار باتیں کیں۔ پھر اسلم کہنے لگا خاندان کب اکٹھا ہو رہا ہے؟ میں آپ کو لینے آجاؤں گا ہم اکٹھے چلیں گے۔ قہقہہ لگاتے ہوئے میں نے کہا اسلم میں نہیں جانتی کہ خاندان کب اکٹھا ہوگا۔ مگر میں ضرور جانتی ہوں کہ مجھے دعوت نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ اجتماع میرے متعلق ہوگا۔ وہ بہت پریشان ہوا۔ میں جانتی تھی کہ مجھے ہر بات بیان

کرنا ہوگی۔ لیکن میں نے کہا "سلم" میری بات سننے کے بعد آپ اجتماع پر ضرور جائیں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ مناسب الفاظ میں مجھے پیش کرسکیں۔ افسردگی میں وہ میرے گھر سے روانہ ہوگیا۔ میں نے سوچا بات بڑھتی جارہی ہے۔ ضروری ہے کہ میں راولپنڈی اور لاہور جاؤں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ ٹونی اور میرا بیٹا خالد کسی اور رنگ میں میرے بارے میں افواہیں سُنیں۔

بذاتِ خود اپنی بیٹی خالدہ کے بارے میں میں کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ وہ افریقہ میں مقیم تھی۔ مگر میں خالد اور ٹونی سے ملاقات کرسکتی تھی۔ اگلے ہی روز میں لاہور کی طرف روانہ ہوئی۔ خالد کے گھر سے عیاں تھا کہ اس کی تجارت خوب چمک رہی ہے۔ ایک قصبہ میں اُس کا عالیشان بنگلہ تھا۔ جس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

ہم اُس کے گیٹ میں سے اندر گئے اور کار پارک کر کے بڑے برآمدہ کی طرف چل دیئے۔ خالد جو خاندان کی وجہ سے اور ٹیلیفون پر میری طویل گفتگو کے سبب سے کافی چوکنّا ہوگیا تھا، مجھے خوش آمدید کہنے کے لئے جلدی سے باہر آیا۔ کہنے لگا امّی! میں آپ سے مل کر کس قدر مسرور ہوں۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے خوش آمدید کہتے ہوئے وہ تھوڑی جھجک محسوس کر رہا تھا۔ بعد از دوپہر میں نے جو کچھ کہا تھا اِس کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ مگر اختتام پر میں جانتی تھی کہ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

اَب ٹونی سے ملاقات کی باری تھی۔ میں راولپنڈی کے لئے چل دی۔ اور سیدھی ہسپتال جا پہنچی اور ٹونی سے ملاقات کی اجازت چاہی۔ انتظار کرتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ اُسے اِس معاملہ

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

کی خبر کیونکر دوں۔ بلاشبہ پہلے ہی وہ کہانیاں سُن چکی ہو گی۔ وہ پہلے ہی آگاہ تھی کہ میں بائیبل کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ کیتھولک ڈاکٹر سے میری گفتگو کا بھی اُسے پتہ ہو جو اُس وقت ہوئی تھی۔ جب محمود اس ہسپتال میں داخل تھا ایک بات سے وہ یقیناً ناواقف تھی کہ ڈاکٹر سینٹو آگو سے ایک ملاقات کیونکر زندگی تبدیل کر سکتی تھی۔ اِسی نے مجھے جرارت دلائی تھی کہ میں خدائے تعالیٰ کو باپ کہہ کر پکاروں۔

ممّی! ٹونی نے جلدی جلدی میری طرف آتے ہوئے مجھے آواز دی۔ سفید یونیفارم میں وہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر ایک چمک تھی۔ اور ملاپ کے لئے اس کے بازو کھلے تھے۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ میں اُٹھی۔ میں اُسے اپنی تبدیلی کے بارے میں کیونکر بتاؤں۔ میں نے اپنی بات بتانے کے لئے نرم الفاظ کی تلاش کی مگر ٹونی کے رُوبرو میں بے بس تھی۔ میں نے سیدھے سادے الفاظ میں کہا "ٹونی" ایک انوکھی خبر سُننے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ دو روز ہوئے میں نے بپتسمہ لے لیا ہے۔ ٹونی پر سکتہ طاری تھا اور اس کی آنکھیں اشکوں سے لبریز تھیں۔ وہ میرے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گئی اور ایسی دھیمی آواز میں بولی جسے میں بمشکل سُن سکتی تھی۔ وہ کہنے لگی کہ اِس کے آثار پہلے سے نظر آ رہے تھے۔ میں نے اسے دلاسہ دینے کی ناکام کوشش کی۔ ٹونی کہنے لگی کہ بہتر ہے میں کام سے چھٹی کر لوں۔ پس اُس نے جلدی گھر جانے کی اجازت لے لی۔ اور ہم اکٹھے اُس کی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ جونہی ٹونی نے دروازہ کھولا اُس کے فون کی گھنٹی بجی۔ جلدی سے اندر جا کر اس نے ٹیلیفون اُٹھایا اور

میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی کہ نینا کا فون ہے۔ اُس نے میرے بارے میں پوچھا۔ ٹونی نے دھیمی آواز میں بتایا کہ یہ سچ ہے۔ اُس نے غصّہ سے فون نیچے رکھ دیا۔ ٹونی نے ٹیلیفون اپنے کان سے ہٹایا۔ میری طرف ایک نگاہ کی اور پریشانی میں نیچے رکھ دیا۔ میں نے وقتی طور پر چُپ رہنے میں بہتری سمجھی اپنی چیزیں سنبھالیں اور چل دی۔ جاتے ہوئے میں نے کہا کہ جب جی چاہے آجانا پھر ہم بات کریں گے۔ ٹونی نے مجھے نہ روکا۔ بس چند منٹ میں میں گھر کی طرف رواں دواں تھی۔

میرے گھر پہنچتے ہی نوکر میرے گرد جمع ہو گئے۔ نور جہاں اپنے ہاتھ مل رہی تھی۔ ریشم کا چہرہ بھی معمول سے زیادہ زرد تھا۔ سارا دن فون آتے رہے ہیں۔ ابھی نوکر یہ سب بتا ہی رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ یہ میری بہن کے شوہر جمیل تھے جو ایک برطانوی تیل کمپنی میں ملازم تھے۔ میں نے ہمیشہ جمیل کو دنیادار آدمی خیال کیا تھا مگر اب اُس کی آواز میں فرق تھا۔ اس نے کرخت لہجہ میں کہا بلقیس! میں نے ایک عجیب سی بات سُنی ہے جس کا مجھے یقین نہیں آتا۔ میرے ساتھ کام کرنے والے ایک دوست سے میں نے سُنا ہے کہ تم مسیحی ہو گئی ہو۔ بلاشُبہ میں اُس پر ہنسا اور اُسے یقین دلایا کہ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی سی تیزی سے پھیل رہی تھی۔ میں نے کچھ نہ کہا۔ جمیل نے زوردار لہجہ میں کہا! یہ داستان سچّی تو نہیں ہے نا؟ میں نے جواب دیا کہ یہ سچ ہے۔ ایک بار پھر خاموشی ...

ٹھیک ... بس ٹھیک ہے۔ جمیل نے تڑاک سے جواب دیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ نے کیا کھویا ہے، اور کس لئے؟ محض ایک اور

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرات کی

مذہبی نکتۂ نظر کے لئے۔

دس منٹ بعد ٹونی کا فون آیا۔ وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ ممّی! انکل نواز ابھی یہ کہتے آئے تھے کہ ایچ محمود کا والد اُسے واپس لینے کا مجاز ہے۔ نواز کا کہنا ہے کہ کوئی عدالت یہ اجازت نہیں دے گی کہ آپ اُسے اپنے پاس رکھ سکیں۔ میں نے اُسے دلاسہ دینے کی کوشش کی مگر اُس کی سسکیاں جاری رہیں۔

اسی شام کچھ دیر بعد جب میں محمود کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھی تھی تو ٹونی اور میری دو بھانجیاں گھر میں داخل ہوئیں۔ میں ان کے زرد چہروں کو دیکھ کر پریشان سی ہو گئی۔ میں نے کہا کھانا کھائیں گی؟ وہ ہمارے ساتھ کھانے میں شامل ہو گئیں۔ میں ان دو جوان لڑکیوں کی ملاقات سے خوش تھی۔ مگر ظاہر تھا کہ وہ مجھ سے ناخوش تھیں۔ گفتگو میں رُوکھا پن تھا۔ یہ تینوں لڑکیاں محمود کی طرف تکتی رہیں کہ وہ کب کھیلنے کے لئے باہر جائے۔ اُس کے جانے کے بعد ایک بھانجی پریشانی کی حالت میں آگے بڑھتے ہوئے کہنے لگی "آنٹی کیا آپ نے یہ جانا ہے کہ دوسرے لوگ اس سے کیا سمجھیں گے؟ وہ آنسوؤں کے ساتھ رونے لگی۔ کیا آپ نے کسی اور کے بارے میں بھی سوچا ہے؟ اس کے ساتھ خاموشی سے بیٹھی ہوئی دوسری بھانجی کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھام لیا میں نے افسردگی سے کہا میری پیاری مجھے فرمانبرداری کرنا لازم تھا۔

ٹونی نے اشکوں سے لبریز آنکھیں میری طرف اُٹھائیں گویا کہ اُس نے میرا کوئی لفظ نہیں سُنا اور میری منت کرنے لگی امّی!

آپ سامان لیں اور وقت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے یہاں سے چل دیں۔

قدرے بلند آواز میں کہنے لگی کیا آپ جانتی ہیں کہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ پر حملہ ہوگا! ہوسکتا ہے کہ آپ کا اپنا بھائی ہی آپ کے خلاف کارروائی کرے! وہ پھر سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ امّی میرے ملنے والے کہتے ہیں کہ آپ کو قتل کر دیا جائے گا۔

میں نرم لہجہ میں بولی، ٹونی مجھے افسوس ہے مگر میں ڈر کے بھاگنے والی نہیں ہوں۔ اگر میں اِس وقت چلی جاؤں تو میں اپنی باقی زندگی دوڑتی ہی رہوں گی۔ یہ کہتے ہوئے میرے باطن میں ایک ارادہ نے جنم لیا۔ اگر خدا کی یہ مرضی ہے تو وہ اِسی گھر میں میری حفاظت کرسکتا ہے۔ اور کوئی مجھے اس گھر سے نہیں نکال سکتا۔ بڑے انوکھے انداز میں اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے میں نے کہا "ان کو مجھ پر حملہ کرنے دو"!

اور پھر وہاں بیٹھے بیٹھے میں نے خدا کی قربت سے اپنے آپ کو جُدا ہوتے محسوس کیا۔ میں بیچارگی کے عالم میں تھی۔ اور میرے کانوں میں میری اپنی ہی آواز گونج رہی تھی۔ لیکن اچانک میں نے پہچان لیا کہ کیا ہُوا ہے۔ پُرانی بلقیس نے اپنی مغروری اور گھمنڈ سے اپنی زندگی کا قبضہ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ میں فیصلہ کر رہی تھی کہ چاہے کچھ بھی ہو مجھے کوئی اس گھر سے نہیں نکالے گا۔ میں آرام سے کرسی پر بیٹھ گئی اور مجھے اس کا بھی پتہ نہ چلا کہ ٹونی مجھ سے مخاطب ہے۔

اچھا ممّی! ٹھیک ہے ٹونی نے روتے ہوئے کہا آپ مسیحی تو ہو ہی گئی ہیں اور اب آپ مسیحی شہید بننا چاہتی ہیں؟ وہ میری کرسی کے پاس دوزانو ہوگئی اور اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔ کیا آپ

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

کہ کوئی پتہ نہیں کہ ہم آپ سے پیار کرتے ہیں۔ پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے کہا ' میری پیاری ، بلاشبہ میں جانتی ہوں۔ خاموشی سے میں نے اپنی معذوری کے لئے خداوند سے معافی مانگی اور عہد کیا کہ جہاں کہیں وہ مجھے لے جانا چاہے میں جاؤں گی۔ اگرچہ مجھے ایسا کرنے میں گھر بھی کیوں نہ چھوڑنا پڑے اس اقرار اور عہد کے ساتھ ہی پھر میں خدائے برحق کی قربت کو محسوس کر رہی تھی۔ اس ساری تبدیلی میں چند منٹ لگے۔ اگرچہ یہ تینوں میرے سامنے بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ میں باخبر تھی کہ ایک اور سطح پر زندگی حرکت میں ہے۔ خداوند اس جگہ موجود تھا اور اسی لمحہ مجھ پر کام کر رہا تھا اور مجھے سکھا رہا تھا۔ اپنی قربت میں رکھنے کے لئے اس کا ہاتھ مجھ پر تھا۔ ٹونی بول رہی تھی اور مجھے اپنے خیال کے ساتھ متفق ہونے کے لئے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ بات جاری رکھتے ہوئے اُس نے کہا اگر محمود کا باپ اُس کا پیچھا کرے تو کیا آپ مجھے بچے کو لے جانے کی اجازت دیں گی۔ اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی " میں تو مسیحی نہیں ہوں " آخر کار تینوں لڑکیاں خاموش ہوگئیں۔ میرے کہنے پر وہ رات کو میرے ہاں رہنے کے لئے رضامند ہوگئیں۔ جونہی میں نے ٹونی اور اپنی بھانجیوں کو شب بخیر کہا مجھے خیال آیا کہ ہمارا کردار کیسے تبدیل ہو چکا تھا۔ کوئی وقت تھا کہ میں اِن کی حفاظت کے بارے میں اِس قدر فکرمند تھی۔ اب ہم ایک دوسرے کے بارے میں فکرمند تھیں۔

اُس رات میں نے دُعا کی کہ خداوند کس قدر مشکل ہے۔ ایسے شخص سے بات کرنا جس کا تجھ پر ایمان نہیں ہے۔ براہ کرم میرے

میرے خاندان کی مدد فرما۔ میں اپنے عزیزوں کی بہبودی کے لئے کس قدر فکرمند ہوں۔

جونہی میں سوئی تو مجھے محسوس ہوا کہ گویا میرا بدن پرواز کر رہا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو ایک گھاس کی ڈھلوان پر کھڑے پایا۔ میرے چاروں طرف صنوبر کے درخت تھے۔ ایک چشمہ میرے قریب ہی پھوٹ رہا تھا۔ میرے چاروں طرف فرشتگان تھے۔ وہ انگنت تعداد میں تھے۔ میں ایک نام سُنتی رہی "مقدّس میکائیل" اِس سے میری حوصلہ افزائی ہوئی۔ اور پھر میں واپس اپنے بستر میں تھی۔ میں جاگنے پر بھی اِس رُوحانی قوت کو محسوس کر سکتی تھی۔ میں محمود کے کمرے میں گئی اور پھر اپنی بیٹی اور بھانجیوں کے کمروں کی طرف گئی اور ان کی طرف اشارہ کیا۔ اور اپنی خوابگاہ میں واپس جاکر خدا کے حضور دوزانوں ہو گئی۔ میں نے دُعا کی اے خداوند تو نے مجھے بہت سے جواب دیئے ہیں۔ اب میری دُعا ہے کہ مجھ پر ظاہر کر کہ تو محمود کے ساتھ کیا کرنے والا ہے۔ میں ٹونی کو جواب دینا چاہتی تھی۔

میں نے بائیبل کھولنے کی تحریک محسوس کی اور یہ حوالہ میرے سامنے آگیا (پیدائش ۱۲ : ۲۲)

تو اپنا ہاتھ لڑکے پر نہ چلا اور نہ اُس سے کچھ کر...

میں نے لمبا سانس لیتے ہوئے کہا "اے باپ میں تیرا شکر کرتی ہوں"۔

ناشتہ پر میں اِس قابل تھی کہ ٹونی کو یقین دلاؤں کہ اس کے بیٹے کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ آپ کو ہرگز فکر کی ضرورت نہیں" میں نے کلام کا حوالہ اُسے دکھایا جو مجھے ملا تھا۔ میں نہیں جانتی

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

کہ یہ میرا اعتقاد تھا یا ٹونی کو روح القدس نے چھُو یا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر اطمینان تھا اور دو روز میں وہ پہلی بار مسکرائی تھی۔ میری بیٹی اور دونوں بھانجیاں اُس روز اُداسی کی حالت میں میرے گھر سے رُخصت ہوئیں۔ مگر دوسرے رشتہ داروں کا آنا جانا جاری رہا۔

چند روز بعد ایک دن ریشم نے بتایا کہ سیڑھیوں کے نیچے کچھ عزیز جن کی تعداد سات تھی مجھ سے مُلاقات کے خواہشمند ہیں میں محمود کے بغیر انہیں ملنا نہیں چاہتی تھی۔ جو کچھ ہو رہا تھا لڑکے کو اس کا علم ہونا چاہیئے۔ اسے ہمراہ لیتے ہوئے ہم سیڑھیوں سے نیچے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ وہاں یہ ساتوں بڑے تکلف کے ساتھ اپنی جگہوں پر براجمان تھے۔ چائے کیک وغیرہ کھانے کے ساتھ ساتھ مختصر گفتگو کے بعد ان میں سے ایک بات کرنے کے لئے تیار ہوا۔ میں متوقع گفتگو سُننے کے لئے مستعد ہو گئی۔ ایک عزیز جس کو میں بچپن سے جانتی تھی کہنے لگے بلقیس ہمیں آپ سے پیار ہے اور جو کچھ آپ نے کیا ہے اس پر ہم سوچ بچار کرتے رہے ہیں۔ اور ہم ایک تجویز آپ کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں جو ہمارے خیال میں آپ کی معاون ہوگی۔

جی ہاں! وہ مُسکراتے ہوئے کہنے لگے کہ اچھا ہے کہ آپ اپنے مسیحی ہونے کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دو۔

آپ کا مطلب ہے کہ میں اپنے ایمان کو راز میں رکھوں۔ "ہاں" میں نے کہا "میں موت کے ڈر سے اپنے ایمان کو راز میں نہیں رکھ سکتی" میں اِن سات بزرگوں کے درمیان گھری ہوئی تھی۔ میرے باپ کے ایک پُرانے دوست نے گھورتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں اس

کی طرف اُسی انداز سے دیکھنے والی تھی کہ میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ آخر وہ اپنے طور پر میری فلاح کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

میں نے کہا مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی خواہش کے مطابق نہیں کر سکتی ہوں۔ مختصر طور پر میں نے کہا۔ میرا ایمان ایک ماہ کے تھوڑے عرصے میں میری زندگی کا سب سے اہم سرمایہ بن گیا ہے میں اس کے بارے میں بالکل خاموش نہیں رہ سکتی۔ میں نے انہیں کلام میں سے وہ آیت بتائی جہاں لکھا ہے:

"پس جو کوئی آدمیوں کے سامنے میرا اقرار کرے گا میں بھی اپنے باپ کے سامنے جو آسمان پر ہے اُس کا اقرار کروں گا۔ مگر جو کوئی آدمیوں کے سامنے میرا انکار کرے گا میں بھی اپنے باپ کے سامنے جو آسمان پر ہے اس کا انکار کروں گا۔" (متی ۱۰: ۳۲: ۳۳)

ایک اور بزرگ کہنے لگا مگر آپ کا ماحول فرق ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے خاموش رہنے سے آپ کا خدا ناخوش نہیں ہوگا۔ اُسے تو پتہ ہی ہے کہ آپ کا اُس پر اعتقاد ہے اور یہ کافی ہے۔ اس نے اسلام سے پھر جانے سے متعلق قرآن سے ایک حوالہ دیا اور کہنے لگا کہ ہمیں ڈر ہے کہ اس پر عمل کرتے ہوئے کوئی آپ کو قتل نہ کر دے۔

انہوں نے دیکھا کہ یہ بحث لاحاصل ہے جب وہ جانے کے لئے اُٹھے تو مجھے الٹی میٹم دے دیا گیا کہ "بلقیس یاد رکھو اگر تم کسی مشکل میں پڑ جاؤ تو تمہارے عزیزوں اور خاندان میں سے کوئی تمہارا ساتھ نہیں دے گا۔ جو ایک وقت سب سے زیادہ میرا خیال کرتے تھے انہیں منہ پھیر لینا ہوگا۔

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

سر ہلا کر میں نے بتایا کہ میں ان کے الفاظ کو خوب سمجھتی ہوں۔ اب میری خواہش تھی کہ اچھا ہو تا کہ میں محمود کو باغ میں کھیلنے کے لئے بھیج دیتی اور وہ یہ سب نہ سُنتا۔ اپنے پاس چھوٹی کرسی پر بیٹھے میں نے اُس کی طرف دیکھا تو وہ مُسکرایا گویا کہ وہ کہہ رہا تھا کہ سب ٹھیک ہے۔

اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ رُخصت ہوتے وقت میری ماں کی قریبی سہیلی نے مجھے بوسہ دیا اور کہا "خدا حافظ"۔ دوبارہ خدا حافظ کہنے کے ساتھ ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جلدی جلدی کمرے سے باہر چلی گئی۔ ان کے جانے کے بعد گھر ایک قبر سے کم نہ تھا۔ یہاں تک کہ محمود کی کھیل کود کا شور بھی مدھم پڑ گیا تھا۔ تین ہفتے گزر گئے میرے گھر میں صرف نوکروں کی آواز سُنائی دیتی تھی۔ اگر مچل اور اولڈ کے ہاں اتوار کی مسلسل عبادتیں نہ ہوتیں تو شاید میں اپنے مسیحی عقیدے پر قائم نہ رہ سکتی۔

ہر روز خاندانی کشیدگی بڑھتی جاتی تھی جب میں اپنے چچازاد بھائی سے بازار میں ملی تو اُس کے چہرے پر قہر عیاں تھا۔ جب میں راولپنڈی کی ایک گلی سے گزری تو میں نے اِس خاندانی جنگ کو اپنے بھانجے کی نفرت انگیز نگاہوں میں محسوس کیا۔ یہی جنگ میری آنٹی کی اس کرخت آواز میں تھی۔ جب اس نے کہا کہ میں تیرے ساتھ کھانا کھانے نہیں آسکتی۔ قطع تعلقی کا آغاز ہو چکا تھا۔ میرا ٹیلیفون کم آتا تھا اور میرے پھاٹک کی گھنٹی بھی خاموش تھی۔ خاندان کا ایک ممبر بھی مجھے بُلانے یا ملامت کرنے نہ آیا۔ میں قرآن کی یہ آیت یاد کر رہی تھی :۔ (سورۂ محمد ۲۲-۲۳)

"اگر یہ لوگ خُدا سے سچّے رہنا چاہتے تو ان کے لئے بہت اچھا ہوتا۔ تم سے عجیب نہیں کہ اگر تم حاکم ہو جاؤ تو ملک میں خرابی کرنے لگو اور اپنے رشتوں کو توڑ ڈالو۔ یہی لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے اور ان کو بہرا اور اندھا کر دیا ہے"

بڑی صفائی سے میں اس کی عملی صورت دیکھ رہی تھی۔ میں نے خونی بندھنوں سے بغاوت کی تھی۔ اور بلاشُبہ میں اپنے خاندان سے نہیں مل سکوں گی اور نہ ہی اب اپنے خاندان سے متعلق کچھ سُنوں گی۔

نوکر بھی میری خدمت میں بہت سنجیدہ اور خاموش تھے۔ میں بمشکل ان سے ہاں کے سوا کچھ اور سُن سکتی تھی اور پھر ایک صبح قطع تعلق نے ایک انوکھا رُوپ لے لیا۔ میں نور جہاں اور ریشم کے خاموش لہجہ اور چہرے پر اُداسی کے سبب سے پریشان تھی یہ ان کی طبیعت کے برعکس تھا۔ ریشم معمول سے زیادہ سنجیدگی سے کام کر رہی تھی۔ اپنے کام میں مشغول بالکل خاموش تھیں۔ ان کے چہروں کے تاثرات سے میں فکرمند تھی۔

میں نور جہاں سے کچھ سُننے کی منتظر تھی۔ مگر خلافِ معمول وہ خاموشی سے کام میں مگن رہی۔ ریشم کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ اچانک میں کہنے لگی، مجھے یوں لگتا ہے کہ گڑبڑ ہے۔ کیا میں جان سکتی ہوں۔ صفائی بند ہو گئی اور مجھے یہ خبر ملی کہ ریشم کے سوا جو اِس وقت میرے رُوبرو کھڑی تھی، میرے تمام مسیحی نوکر جن میں منظور بھی شامل تھا آدھی رات کے قریب میرے گھر سے بھاگ گئے تھے۔

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

نواں باب

"قطع تعلقی"

اِس سرتابی کا کیا مطلب تھا؟ چار ملازم بتائے بغیر فرار ہو گئے! واہ کے اس قصبہ میں جہاں بے روزگاری عام تھی، نوکری چھوڑنے کے فیصلے کو سمجھنا محال تھا۔

بلاشبہ یہ خوف تھا۔ منظور کو یہ ڈر تھا کہ میں نے اسے بائیبل لانے کو کہا تھا اور اُسے کارپرشنریوں کے گھروں میں لے گئی تھی۔ دوسرے تین مسیحی نوکروں نے شاید اس کی پیروی کی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے افواہیں سُنی ہوں کہ آتش فشاں کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے۔ اور وہ اس کے لاوے کی زد سے باہر نکل جانا چاہتے تھے۔

مگر ریشم کی کیا حالت ہے۔ اِس مسیحی ملازمہ ریشم کو کیا ہوا جو ابھی تک یہیں تھی اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میرے بالوں کو سنوار رہی تھی۔ میں نے پوچھا "آپ کیوں نہیں گئیں؟" بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے اور ہونٹ چباتے ہوئے کہنے لگی غالباً مجھے یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیئے۔ ابھی بات اُس کے منہ میں ہی تھی کہ میں نے کہا کیا میں

اکیلی رہ جاؤں گی ؟ تھوک نگلتے ہوئے اس نے کہا " ہاں "
آپ خوفزدہ ہیں نا ! ریشم اگر آپ بھی مجھے چھوڑ دیں تو مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔ جیسے میں نے فیصلہ کیا ہے اسی طرح آپ کو بھی فیصلہ کرنا ہوگا۔ اگر تم میرے ساتھ رہو تو یاد رکھو کہ یسوع نے ہمیں کہا ہے کہ ہمیں اس کی خاطر ستایا جائے گا۔ ریشم نے سر ہلایا اس کی سیاہ آنکھوں میں آنسو تھے۔ اپنے منہ سے سر کی پن نکالتے ہوئے اور میرے بالوں میں لگاتے ہوئے افسردگی سے کہنے لگی " میں جانتی ہوں " دن بھر ریشم خاموش رہی۔ اس کے رویہ سے نورجہاں متاثر تھی۔ وہ بے چینی کی حد تک پہنچ رہی تھی۔ دوسری صبح جب میں اٹھی تو خادمہ بلانے کی گھنٹی بجانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اب میرے ساتھ کون ہوگا۔ میری خوابگاہ کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور نورجہاں اندر آئی۔ پھر سردیوں کی صبح کی مدھم روشنی میں کوئی آیا یہ ریشم تھی۔

بعد میں میں نے اسے بتایا کہ ان کے ساتھ رہنے کو میں کس قدر سراہتی ہوں۔ خوشی سے وہ کھل گئی اور مجھے عمر کی درازی کی دعا دینے لگی۔ جیسے آپ خداوند کی خدمت کرتی ہیں، اسی طرح میں بھی آپ کی خدمت کرتی ہوں۔

میرے مسیحی نوکروں کے جانے کے بعد میرے گھر کی خاموشی اور بھی بڑھ گئی۔ کیونکہ میں نے ان کی جگہ اور نوکر نہ رکھا تھا۔ اب میری ضروریات اور سادہ تھیں۔ کیونکہ کوئی خاندان کا فرد نہیں آتا تھا میں نے فیصلہ کیا کہ وقتی طور پر مسیحیوں کو ملازم نہ رکھا جائے۔ میں نے ایک نیا مسلم ڈرائیور اور ایک نیا معاون باورچی رکھ لیا۔

میں نے اُسے باپ کہنے کی جراءت کی

میں خاص طور پر محمود کے لئے خوش تھی جو گھر میں یا باغ میں بخوشی کھیلتا رہتا تھا۔ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ گاؤں سے دوستوں کو بُلا سکتا ہے۔ اس تجویز کو محمود نے جلدی سے قبول کر لیا۔ بہت سے بچے جو محمود سے عمر میں کچھ بڑے تھے آنے لگے۔ مگر وہ سب پر حُکم چلاتا تھا۔ یہ گمان نہیں کرتی تھی کہ یہ محض اس لئے تھا کہ وہ اُن کا مہمان نواز تھا بلکہ یہ سات سو برس کے وہ لیڈر تھے جن کا خون اس بچے کی رگوں میں رواں دواں تھا۔ اور اس کی آنکھوں کی جھلک دیکھنے سے انکار محال تھا۔ اس وقار کو میں کس قدر مجروح کر رہی تھی۔ اِس لڑکے کے خاندانی بندھنوں کے لئے میں کس قدر خطرے کا باعث تھی۔ ابھی کل ہی اس نے پوچھا تھا کہ کیا اس کا چچازاد بھائی کریم اسے مچھلی کے شکار کے لئے لے جا سکتا ہے۔ کریم نے محمود کو مچھلیاں پکڑنے کے گُر سکھانے کا وعدہ کیا تھا۔ محمود نے پوچھا "ممّی کریم کب آئے گا؟" میں نے لڑکے پر نگاہ کی۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اور میرے پاس یہ کہنے کی جراءت نہیں تھی کہ اس کے مچھلی پکڑنے والی پارٹی کبھی نہیں آئے گی۔ محمود کا مسیحیت کی طرف ابھی کوئی رجحان نہیں تھا۔ میں اسے بائیبل کی کہانیاں پڑھ کر سُناتی تھی۔ اور وہ انہیں اس قدر چاہتا تھا کہ میں نے اس کا سونے کا وقت آٹھ کی بجائے ساڑھے سات کر دیا۔ پس کہانیاں سُنانے اور سُننے کے لئے ہمارے پاس کافی وقت تھا۔ مگر چند کہانیاں مچھلی کے شکار کے مقابلے میں کچھ نہیں تھیں۔ آہستہ آہستہ محمود کے دوست آنے بند ہو گئے۔

محمود یہ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اور جب میں نے یہ اسے بیان کیا تو

وہ پریشانی کی حالت میں میری طرف تکنے لگا۔ کہنے لگا" ممی آپ کس کو زیادہ پیار کرتی ہیں۔ مجھے یا یسوع کو؟ مجھے کیا جواب دینا چاہیئے۔ خاص طور پر اس وقت جب وہ تنہا تھا۔ میں نے کہا محمود" خدا کا مقام پہلا ہے"۔ اگر ہم خاندان کو اس سے زیادہ پیار کریں تو ہم حقیقت میں اُس کے نہیں ہو سکتے۔ لازم ہے کہ ہم خدا کو پہلا درجہ دیں۔ یہاں تک کہ ان سے بھی زیادہ درجہ جن کو ہم دنیا میں سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔

یوں لگتا تھا کہ محمود نے اسے قبول کر لیا ہے۔ جب میں اس کے لئے بائیبل پڑھتی تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ غور سے سُنتا ہے ایک دفعہ جب میں اس کے سامنے یہ پڑھ چکی

" اے محنت اٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو سب میرے پاس آؤ میں تم کو آرام دوں گا"

تو میں نے اس کے سونے کی دُعا سُنی۔ اے یسوع میں آپ کو پیار کرتا ہوں۔ مگر... مہربانی سے مجھے آرام نہ دینا مجھے آرام کرنا پسند نہیں۔ وہ اپنے ہاتھ جوڑتا اور دُعا کرتا۔ لیکن میں جانتی تھی کہ اس کے لئے تنہا رہنا اور مجھے تنہا دیکھنا مشکل تھا۔ اب کوئی رشتہ دار، دوست یا جان پہچان ہمارے گھر کی طرف نہیں آتا تھا۔ فون کی گھنٹی بھی نہیں بجتی تھی۔

پھر ایک صبح تین بجے میرے بستر کے قریب پڑے ہوئے سفید فون کی گھنٹی بجی۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ میں فون کی طرف بڑھی اس وقت کسی کا فون نہیں آسکتا جب تک خاندان میں کوئی موت واقع نہ ہو گئی ہو۔ میں نے فون اُٹھایا اور پہلے صرف زور زور سے

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

ہانپنے کی آواز آئی۔ پھر ایک پتھر کی طرح تین الفاظ مجھے مارے۔ کافر، کافر، کافر۔ فون بند ہو گیا۔ میں اپنے بستر پر پڑی رہی۔ آخر یہ کون تھا؟

شاید اُن سر پھروں میں سے کوئی ہو جن کے بارے میں مجھے میرے بزرگ خبردار کر گئے تھے۔ وہ کیا کر سکتے تھے۔

اے خداوند تجھے پتہ ہے کہ مجھے موت کی پرواہ نہیں۔ مگر میں بہت ڈرپوک ہوں۔ میں دُکھ سہنے کی عادی نہیں۔ تجھے پتہ ہے کہ جب ڈاکٹر ٹیکہ لگاتا ہے تو میں کس قدر بے دِل ہو جاتی ہوں۔ میری دُعا ہے کہ اگر دُکھ کا سایہ بڑھے تو مجھے برداشت کرنے کی قوت دینا۔ اشکوں سے میری آنکھیں لبریز تھیں۔ اے خداوند میرا اندازہ ہے کہ میں شہیدوں کی مٹی سے نہیں بنی۔ جو کچھ بھی اس کے بعد ہونے والا ہے مجھے اس میں چلنے کی توفیق دینا۔

اِس کے بعد ایک گمنام دھمکی کا خط آیا۔ لکھا تھا بات صاف ہو جانی چاہیئے۔ تیری تعریف ایک لفظ میں ہے "غدار"۔ پھر ایک روز خط آیا اور تھوڑی دیر کے بعد ایک اور! سب میں خبردار کیا گیا تھا۔ مسیحی ہونے کی وجہ سے دھمکیاں سننی لازم تھیں۔

۱۹۶۷ء کی گرمیوں میں شام کے قریب میرے مسیحی ہونے کے چھ ماہ بعد میں اپنے باغ میں کھڑی تھی۔ میرے ذہن پر ایک خط کے الفاظ گھوم رہے تھے۔ لکھا تھا کہ میں کافر سے بھی بدتر اور دوسرے وفاداروں کو بہکانے والی ہوں۔ میں صحت مند اعضاء پر ایک ناسور کی مانند ہوں جسے جلا دینا چاہیئے۔ جلا دینا چاہیئے؟ کیا یہ محض ایک استعارہ تھا یا اس سے زیادہ۔ میں باغ کے اندر چلی گئی۔

چاروں طرف طرح طرح کے پھول اپنی رنگینیاں دکھا رہے تھے موسم بہار اپنے جوبن پہ پہنچ کر گرمیوں کے موسم میں داخل ہو چکا تھا۔ پھل دار درخت پھل سے لدے ہوئے تھے اور کچھ دانے پک کر گر گئے تھے۔ میں نے اپنے گھر پر نگاہ کی میں نے اپنے دل سے بات کی۔ وہ میرے گھر کو نہیں جلائیں گے۔ وہ ایک بیگم کو نہیں جلائیں گے۔

مگر بلاشبہ میں صرف اپنی حیثیت اور دولت کے سبب سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں جان سکتی۔ کوئی میری ملاقات کو آیا ہے۔ خادمہ نے اس کی اطلاع دی۔ بیگم جی جرنیل عامر آپ سے ملاقات کے منتظر ہیں۔ میرا دل دہل گیا۔ میں نے باغ کے پھاٹک میں سے نگاہ کی اور واقعی ایک کمانڈر کی کار وہاں کھڑی تھی۔ جرنیل عامر میرے فوج کے ایام میں پرانے جان پہچان کے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں اُن کے ساتھ تھی۔ اور اب وہ پاکستان کی فوج میں اعلیٰ درجے کے جرنیل تھے۔ سال ہا سال سے ہم ایک دوسرے سے ملتے رہے تھے۔ خاص طور پر جب میرا خاوند وزیر داخلہ تھا تو وہ ان کے بہت قریب کام کرتے تھے۔ کیا وہ مجھے مجرم ٹھہرانے آیا ہے۔

جلد ہی میں نے باغ میں اس کے پاؤں کی آہٹ محسوس کی۔ وہ اپنے فوجی لباس میں بہت سج رہے تھے۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور جھک کر اس پہ بوسہ دیا۔ میرا خوف کافور ہو گیا۔ اس کی آمد کا مطلب مخالفت نہ تھا۔ اس نے میری طرف نگاہ کی۔ حسب معمول جرنیل نے مزاحیہ انداز میں کہا جو کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کیا یہ

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

سچ ہے ؟ ۔ "ہاں" ! میں نے جواب دیا۔
آپ کو اس کی کیا ضرورت تھی۔ آپ نے اپنے آپ کو ایک خطرے میں ملوث کر لیا ہے۔ میں نے افواہیں سُنی ہیں کہ کچھ لوگ آپ کو قتل کرنے کے درپے ہیں۔ میں نے خاموشی سے اِس کی طرف نگاہ کی۔
اِس نے مزید کہا "ٹھیک ہے اور وہ باغ میں پڑے ہوئے ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ آپ جانتی ہیں کہ میں ایک بھائی کی طرح ہوں۔
" مجھے یہی اُمید ہے"
"ایک بھائی کی حیثیت سے میں آپ کی حفاظت کا مشتاق ہوں"
" مجھے یہی اُمید ہے"
"تو پھر یاد رکھو کہ میرا گھر ہمیشہ آپ کے لئے کھُلا ہے"۔ میں مُسکرائی۔ پہلی بار نرم جواب مِلا تھا۔ مگر بیان کو جاری رکھتے ہوئے جنرل کہنے لگا ایک بات کو جاننا آپ کے لئے لازم ہے کہ پیشکش شخصی ہے۔ وہ کھِلے ہوئے پھول کی طرف بڑھا، پھول اپنی طرف کھینچا اور سونگھا اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر مزید کہنے لگا "بلقیس! حکومت کی سطح پر میں آپ کے لئے کچھ زیادہ نہیں کرسکتا۔"

"میں جانتی ہوں"۔ میں نے جنرل کا ہاتھ پکڑا اور ہم دونوں اُٹھ بیٹھے اور چلتے چلتے گھر کے اندر داخل ہوئے۔ چلتے ہوئے میں نے اُسے بتایا کہ معاملہ اس قدر آسان نہیں ہے۔ حقیقت پسندانہ لہجے میں جنرل نے کہا۔ اور اس کے آسان ہونے کا کوئی امکان بھی نہیں ہے۔ بعد میں جب میں ڈرائنگ روم میں چائے کا حکم دے چکی تو اُس نے سوالیہ مسکراہٹ سے پوچھا "بلقیس! مجھے

یہ بتاؤ کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟" جو ہوا میں نے اُسے بیان کر دیا اور مجھے پتہ چلا کہ جنرل غور سے سُن رہا تھا۔ کس قدر غیر معمولی طور پر میں نے اُسے اپنی گواہی دے دی۔

میں ایک سپاہی سے مسیح کے بارے میں بات چیت کر رہی تھی۔ اور وہ بھی ایک اعلیٰ آفیسر کے ساتھ۔ اور وہ غور سے سُن رہا تھا۔ مجھے شک ہے کہ کیا واقعی میں اُس بعد از دوپہر جنرل عامر کے دل سے بات کر گئی۔ مگر نصف گھنٹہ پہلے جب اُس نے مجھے شام کے قریب خدا حافظ کہا تو اُس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ متاثر تھا۔ اور پھر رُخصت کے وقت بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگے" بلقیس یاد رکھو جب کبھی آپ کو میری مدد درکار ہو مجھے بتاؤ، جو کچھ میں بحیثیت ایک عزیز کر سکتا ہوں کروں گا۔"

میں نے کہا عامر شکریہ۔ وہ شام کی مدھم تاریکی میں اپنی کار کی طرف چل دیئے اور اس کے ساتھ ہی ہماری نہایت افسردہ اور عجیب ملاقات اختتام پذیر ہوئی۔ میرا خیال نہیں تھا کہ میں اسے پھر کبھی مل سکوں گی۔

پہلی بار قطع تعلقی گمنام خطوط اور پرانے دوستوں کی طرف سے ٹیلیفون پر دھمکیوں میں میں سیکھ رہی تھی کہ زندگی گھڑیاں گن گن کر بسر کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ فکر مند ہونے سے یہ مختلف تھا۔ میں اس بات کے انتظار میں تھی کہ میرا خدا کیا حکم کرنے والا ہے۔ کیونکہ میں قائل تھی کہ اس کی اجازت کے بغیر کچھ وقوع پذیر نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر مجھے معلوم تھا کہ میرے خلاف دباؤ لازم کڑا ہو جائے گا اگر یہ ہوا تو اُس کی اجازت سے ہوگا اور لازمی ہے کہ اس طرح

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

کی بربادی میں میں اپنے خداوند کی حضوری کی متلاشی رہوں۔ زندہ رہنا میرے لئے مسیح ہوگا۔ لازم تھا کہ میں اُس کی رفاقت میں رہنا سیکھوں۔ تاکہ جو کچھ ہو جہاں کہیں بھی ہو میں اُس کے جلال میں پائی جاؤں۔

خاندان کی طرف سے بڑھتے ہوئے دباؤ کے ساتھ مجھے خیال آیا کہ مجھے معلوم ہے کہ داؤد بادشاہ اپنے فرزند ابی سلوم سے فرار کے وقت کیا محسوس کرتا تھا۔ کس طرح وہ ساز اُٹھا کر حمد کرنے لگا "تُو اے خداوند ہر طرف میری سپر ہے۔ میرا فخر اور سرفراز کرنے والا" زبور (۳ : ۳ آیت) میں سمجھتی ہوں کہ اِس سرفرازی سے مُراد فردوس کی خوشیاں تھا۔ وقتی طور پر میرے خاندان کی طرف سے دباؤ قطع تعلق کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میرے خاندان کا ایک فرد بھی مجھے ملنے یا بُرا بھلا کہنے نہ آیا۔ اِس کے علاوہ میرے پُرانے جان پہچان میں سے کوئی ملاقات کو نہ آیا۔ بازار میں مجھے حقارت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ خاندان میں شادی یا غمی کے موقع پر مجھے اطلاع نہ دی جاتی۔ اِس تنہائی پر غور کرنے سے خدا کی قربت کا احساس مدھم پڑنے لگتا۔ اور اپنی رضا و رغبت میں اپنے خیالات کو قید کر کے مسیح کے تابع کر دیتی اور مصیبت کے وقت اس کے ساتھیوں کے چھوڑنے کو یاد کرتی۔ اِس سے مجھے تسلی ہوئی۔ اِس حال میں مجھے رفاقت کی اشد ضرورت تھی۔ اس قدر الگ تھلگ ہونے کے سبب کسی کی رفاقت اور نزدیکی کی طلب گار تھی۔ مسز اولڈ اور مجلنز نے آنا بند کر دیا تھا۔ اُن کی بھلائی کے پیشِ نظر میں نے انہیں اپنے ہاں نہ آنے کی تلقین کی تھی۔

ایک غمناک دوپہر میں بائیبل کے مطالعہ کے لئے اپنی خوابگاہ

میں گئی۔ گرمیوں کا آغاز تھا۔ اور غیر معمولی سی سردی تھی۔ میرے دریچے میں تیز ہوا سے سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ جونہی میں نے مطالعہ شروع کیا میں نے اپنے ہاتھ پر گرمی سی محسوس کی اور کیا دیکھتی ہوں کہ میرے بازو پر سورج کی ایک شعاع پڑ رہی ہے۔ میں نے جو کھڑکی سے جھانکا تو پتہ چلا کہ سورج بادلوں میں اوجھل ہے۔ فقط ایک منٹ کے لئے یوں لگا کہ مجھ تک پہنچ کر خداوند نے میرے ہاتھ کو چھو کر دلاسہ دیا تھا۔

میں نے اُوپر نگاہ کی اور کہا "اے خداوند میں کس قدر تنہا ہوں" یہاں تک کہ نہ بولنے کے سبب سے میں اپنی گالوں پر رُوکھا پن محسوس کرتی ہوں۔ برائے کرم آج کسی کو مجھ سے گفتگو کرنے کے لئے بھیج دے۔

ایسی بچگانہ مانگ کرنے سے اپنی ہی نگاہ میں احمق دکھائی دیتی تھی۔ میں پھر بائیبل کی طرف متوجہ ہوئی۔ بہرصورت خداوند میرا ساتھی تھا۔ اور یہ کافی تھا۔ مگر تھوڑی دیر میں گھر میں ایک عجیب شور سے میں چوکنی ہو گئی۔ عجیب اس لئے کیونکہ عرصہ دراز سے یہ شور بند تھا۔ سیڑھیوں کے نیچے کچھ آوازیں تھیں۔ میں نے اپنی شال اوڑھی اور تیزی سے نورجہاں کو ملنے کے لئے چلی جس کا سانس پھولا ہوا تھا اور دوڑتی ہوئی میری طرف آ رہی تھی۔ چیختے ہوئے کہنے لگی "اوہ بیگم صاحبہ! مسٹر اور مسز اولڈ آئے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے کہ "خداوند کی تعریف ہو"۔ میں جلدی سے انہیں ملنے کے لئے آگے بڑھی۔ بلاشبہ اتوار کی عبادتوں پر مسٹر اور مسز اولڈ سے اُن کے گھر میں میری ملاقات ہوئی تھی۔ مگر یہ ملاقات اس سے مختلف تھی۔ کیونکہ یہ ہفتہ کے دوران ملاقات تھی۔ مسز اولڈ تیزی

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرات کی

سے میری طرف بڑھی اور میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہنے لگی بلقیس ہمارا دل چاہتا تھا کہ آپ سے ملاقات کریں۔ اس کی نیلی آنکھوں میں شعلے کی سی چمک تھی۔ کہنے لگی کہ ملنے کی کوئی خاص وجہ تو نہیں مگر آپ کی رفاقت ہمیں یہاں کھینچ لائی ہے۔

بہت خوشگوار ملاقات تھی۔ بات چیت کے دوران میں نے بھانپا کہ میں لوگوں سے اپنے ہاں ملاقات کے لئے نہ آنے کو کہنے میں غلطی کرتی رہی تھی۔ غرور نے ضرورت کو تسلیم کرنے سے باز رکھا ہے۔ اچانک میرے دل میں آیا کہ لوگوں کو اتوار کے روز عبادت کے لئے اپنے گھر کیوں نہ دعوت دوں؟ لیکن یہ جلتی پر تیل چھڑکنے کے برابر ہوگا۔ میں نے اس خیال کو دل سے نکالنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ رخصت ہونے ہی والے تھے کہ میں جلدی سے بول اُٹھی کیا اس اتوار کی رات آپ میرے ہاں تشریف لانا پسند کریں گے؟ اولڈنے قدرے پریشانی میں میری طرف دیکھا۔ اپنا ہاتھ ہلاتے ہوئے میں نے کہا جو میں کہتی ہوں وہ میرا مطلب ہے اس قدیم عمارت کو کچھ زندگی درکار ہے۔ لہٰذا میرے گھر عبادت کے انعقاد کا فیصلہ ہوگیا۔

اس شام جب میں سونے کی تیاری کر رہی تھی تو مجھے خیال آیا کہ خداوند ہماری مناجاتیں کس قدر احسن انداز میں سُنتا ہے۔ جب میرا خاندان اور میرے دوست مجھ سے دُور ہٹ گئے تو ان کی جگہ اس نے اپنے خاندان اور دوستوں سے پُر کر دی۔ میں سکون سے سوگئی۔ اور صبح اُٹھنے پر خوشی محسوس کر رہی تھی۔ میں نے اُٹھ کر کھڑکی کھولی اور بادِ صبا کا ایک جھونکا کمرے میں آیا۔ گرمیوں کی مہکتی ہوا

سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

میں اتوار کی شام کے آنے کا انتظار کرنے سے قاصر تھی۔ ہفتہ کو دوپہر کے بعد تک میرا پرانا گھر پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ ہر کھڑکی دروازے اور فرش پر اس قدر پھول تھے کہ گھر چہکنے لگا میں نے ریشم سے کہا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ عبادت میں شامل ہو سکتی ہے۔ مگر وہ کچھ خوفزدہ سی ہو گئی۔ وہ اس قدر دلیرانہ اقدام کے لئے مستعد نہ تھی اور میں نے بھی دباؤ نہ ڈالا۔

اتوار آ گیا۔ میں نے محمود کو ڈرائنگ روم سے دور رکھا پھولوں کو سجانے اور گرد و غبار جھاڑنے میں لگی رہی۔ آخر کار میں نے پھاٹک کھلنے کی آواز سنی اور کاریں اندر داخل ہوئیں۔

یہ شام اپنے اندر میری تمام اُمیدیں سمیٹے ہوئے تھی۔ گیت گائے گئے دُعائیں کی گئیں۔ اور ایک دوسرے کو بتایا گیا کہ خداوند کیا کر رہا ہے۔ ہم فقط محمود کے ہم عمروں پر حیران تھے۔ جو آرام سے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ مگر میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ ہزاروں اور نادیدہ مہمانوں کو بھی خوش آمدید کیا گیا۔

اس شام کا ایک اور خاص مدعا بھی تھا۔ جس سے میں آگاہ نہیں تھی۔ پتہ چلا کہ میرے مسیحی عزیز میرے لئے ابھی تک فکرمند تھے مسز اولڈ کہنے لگی کیا آپ ضرورت سے زیادہ محتاط ہیں؟ ہنستے ہوئے میں نے کہا خیر میں کچھ زیادہ نہیں کر سکتی ہوں۔ اگر کوئی مجھے ضرر پہنچانا چاہتا ہے تو مجھے یقین ہے کہ اُسے راہ مل جائیگی۔ مسز مچل نے پوچھا آپ کی خوابگاہ کہاں ہے؟ ہر ایک نے مناسب سمجھا کہ میرا کمرہ دیکھیں۔ پس سب میرے کمرے میں جمع ہو گئے۔

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

مسٹر اولڈ خاص طور پر میری کھڑکیوں کے بارے میں فکرمند تھا۔ باہر باغ میں دیکھتے ہوئے کہنے لگا کہ شیشہ اور نقش و نگار کے سوا ان میں کوئی مضبوطی نہیں ہے۔ سر ہلاتے ہوئے اس نے کہا" آپ جانتی ہیں کہ حقیقت میں آپ محفوظ نہیں ہیں " بلقیس" اس کے بارے میں کچھ کرنا چاہیئے کسی قسم کی مضبوط سلاخیں لگوالو۔ اس میں سے تو کوئی بھی اندر داخل ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا " میں کل اس کے بارے میں کچھ کروں گی"۔ کیا یہ میرا تصوّر ہی تھا یا واقعی میرے یہ الفاظ کہنے سے خدا کی حضوری مدھم پڑ رہی تھی۔

بالآخر خدا حافظ کہہ کر ہم جُدا ہوئے اور میں گزشتہ روز سے زیادہ مسرور سونے کی تیاری کرنے لگی۔ دوسرے روز تاہم جب میں گاؤں میں لوہار کو بُلانے کسی کو بھیجنے ہی والی تھی کہ ایک بار پھر میں خداوند کی حضوری کے رخصت ہونے سے آگاہ ہوئی۔ کیوں؟ کیا اِس لئے نہیں کہ میں ایسا قدم اُٹھانے والی تھی جس کی بُنیاد خوف پر تھی۔ یقیناً ہر بار جب میں نے لوہار کو بُلانے کی کوشش کی میرا یہ قدم روک دیا گیا۔

اور پھر میں نے سوچا نا کہ کیوں جب گاؤں میں خبر پہنچے گی کہ میں اپنی کھڑکیوں میں لوہے کی سلاخیں لگوا رہی ہوں تو ہر ایک جان جائے گا کہ میں خوف زدہ ہوں۔ اس طرح کی چہ میگوئیاں ہوں گی " ہوں! یہ مسیحی مذہب کس قسم کا ہے! جب آپ مسیحی ہو جاتے ہیں تو آپ ڈرپوک بن جاتے ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنی کھڑکیوں میں سلاخیں نہیں لگواؤں گی۔

اُس رات میں پُر اعتمادی سے سو گئی کہ میں نے صحیح فیصلہ کیا ہے

میں جلد ہی سو گئی۔ مگر ایک آواز سے میں یکایک جاگ گئی۔ میں بے خوف جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ میرے سامنے ایک عجیب و غریب نظارہ تھا۔ مافوق الفطرت طور پر اپنے کمرے کی دیواروں میں سے سارا باغیچہ دیکھ سکتی تھی۔ اس پر سفید آسمانی روشنی کا ایک سیلاب تھا۔ میں ہر ایک پھول، درخت، ان کے پتے، گھاس اس کے ہر تنکے کانٹے کو دیکھ سکتی تھی اور باغ پر ایک مقدس سکوت تھا۔ اپنے دل میں میں نے اپنے آسمانی باپ کو یہ کہتے ہوئے سُنا "بلقیس تم نے مناسب قدم اُٹھایا ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔

آہستہ آہستہ نور مدھم پڑ تا گیا۔ اور کمرہ پھر تاریکی میں ڈوب گیا۔ میں نے اپنے بستر کے پاس لیمپ کو روشن کیا۔ اور اپنے ہاتھ اُٹھا کر اپنے خدا کی تعریف کرنے لگی۔ اے باپ میں کیونکر تیرا شکر بجا لا سکتی ہوں؟ ہم میں سے ہر ایک کا تو کیونکر کس قدر خیال کرتا ہے۔

اگلی صبح میں نے اپنے سب ملازمین کو اکٹھے بلایا اور اُن سے کہا کہ اگر چاہیں تو اپنے گھروں میں سو سکتے ہیں۔ فقط میں اور محمود ہی اس بڑے گھر میں سوئیں گے۔ ملازمین ایک دوسرے کو گھورنے لگے۔ کچھ پریشان تھے۔ کچھ خوش اور کچھ ہراساں تھے۔ مگر میں جانتی تھی کہ بالآخر ایک بات انجام کو پہنچی ہے۔ اس فیصلے سے اپنی حفاظت آپ کے ہر خیال کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اس فیصلے کے ساتھ میں خداوند کی قربت میں تھی۔ میں خداوند کی حضوری کو محسوس کر سکتی تھی۔ شاید آئندہ واقعات کے لئے یہ اہم تھا۔

ایک صبح جب ریشم میرے بالوں میں کنگھی کرتے وقت وہ یوں ہی بول اُٹھی میں نے سُنا ہے کہ آپ کی آنٹی کا بیٹا کریم

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

فوت ہوگیا ہے۔

میں کرسی سے اُچھل پڑی اور غیر یقینی کے عالم میں اُسے تکتے ہوئے کہنے لگی نہیں! نہیں کریم نہیں۔ وہ تو محمود کو مچھلی کے شکار کے لئے لے جانے والا تھا۔ وہ اُن میں سے تھا جن سے مجھے اُنس تھا۔ مجھے کریم کی موت کے بارے میں بھی نوکروں ہی سے معلوم کرنا تھا۔ فولادی خودداری کے ساتھ میں نے اپنے آپ کو کرسی پہ بیٹھے رہنے کے لئے مجبور کیا تاکہ ریشم اپنا کام جاری رکھ سکے۔ مگر میرا ذہن چکرا رہا تھا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے کہ یہ محض افواہ ہی ہو۔ ریشم نام لینے میں غلطی کر سکتی ہے۔ میرا دل کچھ سنبھلا بعد میں نوکروں میں سے ایک بزرگ ملازمہ کو میں نے کہا کہ وہ میرے لئے حالات کی صحیح اطلاع لائے۔ وہ گاؤں میں گئی اور ایک گھنٹہ کے بعد افسردہ حالت میں واپس لوٹی کہنے لگی "بیگم صاحبہ! مجھے افسوس ہے مگر یہ خبر سچی ہے۔ وہ کل رات دل کی دھڑکن بند ہو جانے سے چل بسا۔ اور آج اس کا جنازہ ہوگا۔" پھر یہ نوکر جیسے ہر بات جاننے میں سہولت تھی ایک اور خبر لائی جس سے مجھے اور بھی چوٹ لگی۔ مجھے اطلاع ملی کہ میری آنٹی نے اپنے بیٹے سے میری الفت کے پیش نظر خاص طور پہ خاندان سے کہا تھا کہ بلقیس کو ضرور اطلاع کر دی جائے کہ کریم فوت ہوگیا ہے، مگر کسی نے اس کی نہ مانی۔

بعد میں میں کھڑکی کے پاس بیٹھے اس پہ غور کر رہی تھی۔ چھ ماہ سے میں خاندانی معاملات میں ملوث نہ تھی۔ مگر قطع تعلقی نے اس قدر دُکھ نہ دیا تھا جس قدر اس واقعہ نے۔ گم سُم بیٹھی میں مدد کے لئے

خداوند سے دُعا کرنے لگی اور اس نے میری سُنی۔ یوں لگا جیسے ایک گرم کمبل بڑے سلیقہ سے میرے کندھوں پر رکھ دیا گیا ہو۔ اور جذبات کے ساتھ ہی ایک غیر معمولی اقدام کرنے کی تحریک ہوئی جس کے تصوّر ہی سے میں کانپ اٹھی۔ اقدام قدرے دلیرانہ تھا کہ میں جان گئی کہ لازماً یہ خداوند کی طرف سے ہے۔

دسواں باب

"اُس کی حضوری میں جینے کا سبق"

کھڑکی کے پاس بیٹھی میں باغیچہ کو دیکھ رہی تھی۔ یہاں کریم اور میں بچپن میں کھیلا کرتے تھے۔ تند و تیز آندھی سے درخت جھکے جا رہے تھے۔ میں اِن میں سے ایک غیر معمولی پیغام حاصل کر رہی تھی۔ یہ یقین کرنا محال تھا کہ میں ٹھیک طور سے سُن رہی ہوں۔

مُسکراتے ہوئے میں نے کہا" اے خداوند یہ حقیقت میں تیرا پیغام نہیں ہو سکتا۔ میں مختلف آوازیں سُن رہی تھی۔ مثلاً یہ خدا کی مرضی نہیں کہ میں کریم کے جنازہ پر جاؤں یہ مناسب نہیں۔ یہ لاحاصل ہوگا۔ میں اُن لوگوں کے زخمی دلوں پہ نمک سے کم نہ ہوں گی۔

اِن آوازوں کے مشنوا ہونے سے میں نے ایک بار اور پہچانا کہ خُدا کی حضوری کا احساس مدھم ہونا شروع ہو گیا ہے۔ فوری طور پر اِس سگنل کے ساتھ مجھے خیال ہونے لگا کہ شاید مجھے قطع تعلق اور رقابت کے رُوبرو جانے کے اس غیر معمولی اقدام کی تحریک ہو رہی ہے۔

بالآخر ایک لمبا سانس لیتے ہوئے میں کھڑکی کے قریب
اپنی جگہ سے اُٹھی اور قدرے اُونچی آواز میں بولی خداوند میں
نے سیکھنا شروع کر دیا ہے۔ خداوند جو تو کہتا ہے بے شک میرے لئے وہ
ناقابلِ فہم ہے تو بھی وہ درست ہے۔ چونکہ تو مجھے تلقین کر رہا ہے اس لئے میں جاؤنگی۔
بلاشبہ اس کی حضوری کا احساس لوٹ آیا تھا اس کی حضوری کے
آنے اور جانے کے سلسلہ وار تجربات کس قدر غیر معمولی تھے۔ ابھی تک
مجھے احساس تھا کہ میں اس فہم کی صرف ہوا ہی کو چھُو پائی ہوں۔ میں
اس کی حضوری کے زیادہ دیر ٹھہرنے کو میں کیونکر سیکھ سکوں گی ؟
مجھے معلوم نہیں تھا کہ آئندہ دو ماہ میں مجھے ایسے سلسلہ وار تجربات
ہوں گے جو سیکھنے کے سلسلہ میں مجھے ایک قدم آگے لے جائیں گے۔ میں
کریم کے گھر جھجکتی ہوئی چلی گئی۔ باوجود فرمان بجالانے کے وعدہ
کے میری حالت اُس بے یار و مددگار فاختہ کی سی تھی۔ جیسے ایک
ہزار ناگوں کے درمیان پھینک دیا گیا ہو۔ ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے
میں پتھروں سے بنے ہوئے اس گھر کی طرف بڑھی۔ صحن کی طرف
چلتے ہوئے برآمدے کی طرف بڑھی۔ دائرہ میں بیٹھے دیہاتیوں کی
نگاہیں مجھ پر جمی تھیں۔ میں اس قدیم طرز کی عمارت کے اندر داخل
ہوئی جہاں اکثر و بیشتر کریم اور میں خوشگوار وقت دیکھ چکے تھے۔
اب کوئی ہنسی موقوف تھی۔ سوگوار خاندان کے غم میں مجھ سے
ان کی نفرت نے مزید اضافہ کر دیا۔ میں نے اپنے اس چچازاد بھائی
کی طرف دیکھا جس کے میں بہت قریب تھی۔ ایک منٹ کے لئے ہماری
نگاہیں دوچار ہوئیں۔ میرے چچازاد بھائی نے جلدی اپنا منہ موڑ
کر ایک ہمسائے سے باتیں شروع کر دیں۔

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرات کی

میں سیدھی کریم کے کمرے کی طرف بڑھی اور اندر جا کر اُس دری پر بیٹھ گئی۔ جو فرش پر بچھی تھی۔ میری موجودگی سے لوگ گویا ہڑبڑا کر نیند سے جاگ اٹھے۔ دلاسہ دینے والی گفتگو یکایک اختتام پذیر ہوئی۔ یہاں تک کہ قرآن خوانی کرنے والی خواتین بھی رُک گئیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہاں بیٹھے ہوئے ہر شخص کو گویا سانپ ڈس گیا ہو۔ میں نے کچھ نہ کہا اور نہ ہی ملنسار بننے کی سعی کی۔ فقط اپنی آنکھیں جھکا کر دل میں دُعا کرتی رہی کہ "اے خداوند یسوع جب میں ان عزیزوں اور رشتہ داروں کے رُوبرو جو کریم کی موت کے سبب سے غمناک ہیں تجھے پیش کروں تو تو میرے ساتھ ہونا۔

کوئی پندرہ منٹ کے بعد پھر گفتگو شروع ہوگئی۔ میں نے کریم کی اہلیہ کو دلاسہ دینے کا ارادہ کیا۔ اپنا سر اُوپر اٹھاتے ہوئے میں دری پر سے اُٹھی اور متصل کمرے میں داخل ہوئی۔ جہاں ایک لمبے تابوت میں کریم کی لاش پڑی تھی۔ کریم کی بیوی کو دلاسہ دینے کے بعد میں نے اپنی پیاری چچی کے چہرے پر نگاہ کی۔ جو سوگ کے سفید کپڑوں میں ملبوس تھی۔ اپنے دل میں میں نے یسوع سے کریم کی روح کے لئے دُعا کی کاش کہ اُس کی موت سے پہلے اُسے یسوع کے بارے میں بتا سکتی۔ خاندان کے قریبی افراد کریم کے لئے دُعائیں کر رہے تھے۔ خواتین کھڑی ہوتیں اور قرآن سے آیات پڑھتیں۔ میں خوب جانتی تھی کہ یہ وہ حصّے ہیں جہاں زندگی اور موت کا ذکر ہے۔ آج سورج غروب ہونے سے پہلے جنازہ اُٹھے گا۔ جس میں تمام اہل خانہ جلوس کی صورت میں چلیں گے۔ جنازہ اٹھانے والے اُسے قبرستان میں لے آئیں گے اور جنازہ پڑھا جائے گا۔

کمرے میں کھڑی میں یہ سب آوازیں سُن رہی تھی۔ کریم کی ماں جنازے کے پاس دوزانو تھی۔ وہ اس قدر رنجیدہ دکھائی دیتی تھی کہ میرے دِل سے یہ خواہش اُٹھی کہ میں اِس کے پاس جاؤں۔ کیا میں جرارت کروں؟ کیا یہ بے عزتی تو نہیں ہوگی؟ کیا میں یسوع سے متعلق کچھ کہوں؟ شاید نہیں میرا بحیثیت مسیحی یہاں ہونا ہی یسوع کو اُن تک لا رہا تھا۔

پھر نوع میں کریم کی ماں کی طرف بڑھی اور اپنے بازو اس کے کندھے پر رکھتے ہوئے غمناک آواز میں بیان کرنے لگی کہ مجھے کس قدر افسوس ہے۔ کریم اور میں کس قدر ایک دوسرے کے قریب تھے۔ کاش خدا آپ کو برکت دے اور دلاسہ دے۔ کریم کی ماں نے اپنا چہرہ میری طرف کیا۔ اس کی سیاہ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ آنکھیں میرا شکریہ ادا کر رہی تھیں۔ اور میں جانتی تھی کہ اُس کے غمناک دل کو اِسی وقت یسوع دلاسہ دے رہا ہے۔

مگر اُس کمرے میں فقط کریم کی ماں ہی میرے دلاسہ کو قبول کر رہی تھی۔ جونہی میں اُسے چھوڑ کر سوگواروں کے درمیان بیٹھنے کے لئے پھری تو ایک قریبی چچا زاد نفرت کا اظہار کرتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ ایک اور چچا زاد بھائی اِسی طرح چل دیئے۔ میں وہاں بیٹھی طرح طرح کے جذباتی خیالات سے جدوجہد کر رہی تھی۔ میرا دل دھڑکا ان کی دُشمنی مجھ پر غالب آ رہی تھی۔ مناسب وقت تک بیٹھنے اور اس کے بعد رخصت ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میرے رخصتی پر گھر کے تمام افراد مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔

اپنی کار میں بیٹھے ہوئے میں خیالات کو جمع کرنے کی کوشش میں تھی

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت تھی

میں نے فرمانبرداری کی تھی۔ یقیناً اس خفگی کا سامنا کرنے کی بجائے میں گھر میں بیٹھے رہنے کو ترجیح دیتی۔

اگر میں یہ سوچتی کہ مجھے اُس وادی میں سے فقط ایک ہی بار گزرنا تھا۔ تو یہ غلط ہوتا۔ چند ہفتے بعد جب گرمی شدید تھی ایک اور چچازاد بھائی رحلت فرما گیا۔ اُس موت کے بارے میں بھی نوکروں ہی سے پتہ چلا۔ دوبارہ خداوند کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میں سوگواروں سے بھرے ہوئے کمرے میں داخل ہوگئی۔ ہر طرف نفرت کی نگاہیں تھیں۔ اپنی مرضی کے مطابق اپنے آپ سے نظریں ہٹا کر ایک ایسے شخص پر لگائیں جو بہت دُکھی تھا۔ اور یہ مرنے والے بھائی کی بیوی تھی۔ اس کا ایک بچہ تھا جو پانچ برس کا تھا اور محمود کا ہم عمر تھا تابوت کے پاس کھڑی وہ اس قدر غمگین تھی کہ میں اس کے لئے اور اس کے خاندان کے لئے روئی۔

پھر جس طرح میں نے کریم کے جنازہ پر کیا تھا۔ میں اس غمزدہ عورت کی طرف بڑھی۔ جونہی میں قریب آئی اور ہماری آنکھیں دوچار ہوئیں اس کے اشک آلود چہرے پر جھجک تھی۔ اچانک یہ جانتے ہوئے کہ وہ خاندان کی مرضی کے خلاف اقدام کر رہی تھی، اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ اس کا زرد ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔ میں خاموشی سے روئی۔ ہم نے ایک دو الفاظ میں بات کی۔ مگر میرا دل یہ دُعا کر رہا تھا کہ رُوح القدس اس کے زخمی دل پر مرہم لگائے۔ اور اپنا وعدہ اس عزیز مسلمان کے لئے بھی پورا کرے کہ مبارک ہیں وہ جو غمزدہ ہیں۔

میرا ہاتھ چھوڑتے ہوئے خاموش لہجے میں وہ بیوہ کہنے لگی،

"بلقیس آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں پھر اس سے بغلگیر ہوئی اور کمرے

سے چل دی۔

اتفاقاً اور اموات ہوئیں۔ ہمارے خاندان کے سائر کے پیش نظر یہ قدرے غیر معمولی تھا۔ مگر ہر بار خداوند نے بڑی صفائی سے مجھے بتایا کہ میں اپنے گھر سے نکل کر اُس جگہ جاؤں جہاں میری ضرورت ہے بہت باتیں نہیں کرتا تھیں۔ یہی میری گواہی تھی کہ مجھے اس کا پاس ہے۔

اِس سارے وقت میں خداوند میرے ساتھ کام کر رہا تھا۔ مجھے سکھانے کے لئے وہ اِن اموات کو بحیثیت کلاس روم استعمال کر رہا تھا۔ خاندانی اموات پر جانے کے ایک موقع پر میں نے خداوند کی حضوری میں ٹھہرنے کا ایک دُوسرا بڑا بھید دریافت کیا۔

دستور کے مطابق جب تک لاش دفن نہ ہو کوئی نہیں کھاتا۔ عام طور پر یہ کوئی ایک روز کے روزہ کے برابر ہوتا تھا۔ تاہم اس روز لوگوں کے ہجوم سے بھرے ہوئے اِس کمرے میں جب میں گویا تنہا تھی تو اچانک مجھے معلوم ہوا کہ مجھے بعد از دوپہر کی چائے درکار ہے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر میں نہیں رہ سکتی۔ بالآخر جب میں اپنی خواہش پر قابو نہ پا سکی تو میں معذرت چاہتے ہوئے اُٹھی۔ میں نے کہا "مجھے اپنے ہاتھ دھونے ہیں۔ میں گھر سے نکل کر گلی میں ایک چھوٹے ہوٹل میں چلی گئی۔ وہاں میں نے چائے پینے کے بعد سوگواروں میں لوٹ آئی۔ اچانک میں نے ایک عجیب سی تنہائی محسوس کی۔ یوں لگتا تھا کہ ایک دوست مجھ سے جُدا ہو گیا ہے۔ بلاشبہ میں جانتی تھی کہ کیا ہوا ہے۔ خدائے تعالیٰ کے رُوح کی دلاسہ دینے والی حضوری مجھے چھوڑ چکی تھی۔

میں اپنے آپ سے ہم کلام ہوئی کہ خداوند میں کیا کر بیٹھی ہوں۔ اور

میں نے اُسے باپ کہنے کی جراءت کی

پھر مجھے پتہ چلا کہ میں نے معذرت چاہتے ہوئے جھوٹ بولا تھا۔ خدا کے رُوح سے مجھے کوئی اطمینان نہ ملا۔

میں نے اپنے دل میں کہا "اے خداوند مجھے ان سوگوار مسلمانوں کے دستور سے اب کیا واسطہ ہے۔ علاوہ ازیں تو جانتا ہے کہ میں اپنی چائے کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ خداوند کے رُوح کا احساس موقوف تھا۔ اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دینے کے لئے میں اپنے دل میں کہنے لگی "مگر اے باپ میں اُنہیں کیونکر صفائی سے بیان کر سکتی تھی کہ میں چائے کے لئے جا رہی ہوں، یہ ان کے لئے دُکھ کا باعث ہوتا"۔ اُس کے رُوح کا کوئی احساس نہ تھا۔

میں نے کہا اے باپ میں سمجھتی ہوں کہ میرے لئے جھوٹ بولنا بجا نہ تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ میں آدمیوں سے عزت چاہتی تھی، جبکہ مجھے فقط تیری خوشنودی کے لئے جینا تھا۔ خداوند مجھے افسوس ہے کہ میں نے تجھے رنجیدہ کیا ہے۔ تیری مدد سے میں یہ پھر نہیں کرونگی۔

اور ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کی دلاسہ دینے والی حضوری پھر مجھ میں عود کر آئی۔ یہ اِس بارش کی طرح تھی، جو جھیل کی خشک زمین پر پڑے۔ میں مطمئن تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ میرے ساتھ ہے۔ اور اس طرح میں نے اس کی حضوری میں لوٹنا سیکھا۔ جب کبھی میں اُس کی نزدیکی محسوس نہ کرتی تو مجھے پتہ چلتا کہ میں نے اُسے رنجیدہ کیا ہے۔ میں اِس کا سبب تلاش کرتی اور اُس وقت کو دیکھتی جب آخری بار میں نے اُس کی حضوری کو جانا تھا۔ پھر میں اپنے ہر فعل ہر قول اور خیال پر نگاہ کرتی یہاں تک کہ مجھے معلوم ہو جاتا کہ میں کہاں سے گری ہوں۔ اِس مقام پر میں اپنے گناہ کا اقرار کرتی

اور اُس سے معافی مانگتی۔ میں نے بڑھتی ہوئی دلیری کے ساتھ یہ ڈھنگ سیکھا۔ فرمانبرداری کی ان مشقوں کے ذریعے سے میں نے توبہ کا سا خوبصورت بھید سیکھا۔ میں نے دریافت کیا توبہ کا مفہوم اشکوں کے ساتھ شرمندگی نہیں تھی۔ بلکہ یہ اس بات کو تسلیم کرنے کا نام تھا کہ میں نے کہاں خطا کی ہے۔ اور آئندہ خداوند کی مدد سے میں اسے ہرگز نہیں دہراؤں گی۔ اپنی کمزوری کو تسلیم کرنے سے اُس کی قوت کو پا سکتی تھی۔

اِس وقت کے دوران ہی میں نے دریافت کیا کہ ہاں کی جگہ ہاں اور نہ کی جگہ نہ بہترین اصول ہے۔ جھوٹ جھوٹ ہے۔ اور ہمیشہ شیطان کی طرف سے ہے۔ جو جھوٹوں کا باپ ہے۔ وہ جھوٹ بولنے کی مہلک عادت کو تحریک دینے کے لئے بے ضرر سفید جھوٹوں کو استعمال کرتا ہے۔ جھوٹ بڑی آزمائشوں کے لئے راہ ہموار کرتے ہیں۔ شیطان سرگوشی میں کہتا ہے کہ سفید جھوٹ دوسروں کا لحاظ رکھنے کا ایک ڈھنگ ہے۔ ہم یسوع کی جانب جھکنے کی بجائے جو سچائی ہے اپنے آپ کو دُنیا کی جانب جُھکاتے ہیں۔

اگرچہ میں نے یہ سبق ایک رشتہ دار کے جنازے پر سیکھا۔ میرے لئے ایک نئی طرزِ زندگی کا آغاز تھا۔ میں نے تمام جھوٹ کا قلع قمع کرنے کی سعی کی۔ اُس روز کے بعد جب مجھے سفید جھوٹ کی آزمائش آتی تو میں اپنے آپ کو قابو میں کر لیتی۔ ایک دفعہ ایک مشنری عزیز نے مجھے ایک جلسہ میں مدعو کیا۔ میں جانا پسند نہیں کرتی تھی۔ میں یہ بہانہ تراشنے کی تیاری میں تھی کہ مجھے کسی اور جگہ جانا ہے کہ میرے باطن میں خطرے کا الارم بجا اور میں نے بروقت اپنے خیالات

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

کو قید میں کر لیا۔ محض یہ کہنے سے کہ مجھے افسوس ہے کہ میں نہیں آسکوں گی معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو سکتا ہے۔

ایک اور روز ایک عزیز کو لندن میں خط لکھنے بیٹھی بلا تامل میں نے لکھنا شروع کر دیا کہ میں کچھ عرصے کے لئے گھر سے باہر تھی۔ اِس لئے اِس کے آخری خط کا جواب نہیں دے سکی۔ فوراً خیال پیدا ہوا کہ میں تو قصبہ سے باہر ہرگز نہیں گئی۔ اِس کے ساتھ ہی میں نے کاغذ کو ردی کی ٹوکری میں پھینکا اور پھر لکھنے لگی، عزیزم! برائے مہربانی مجھے معاف کریں کہ میں آپ کے اِس قدر خوبصورت خط کا جلدی جواب نہیں دے سکی۔ یقیناً یہ جھوٹی باتیں ہیں۔ مگر میں جھوٹی باتوں میں محتاط رہنا سیکھ رہی تھی۔ کیونکہ یہ بڑی آزمائشوں کو قابو میں رکھنے کی قوت دیتی ہیں۔ علاوہ ازیں جب حیلے بہانے تراشنے کی کوفت سے چھٹکارا ہو گیا۔

آہستہ آہستہ اور یقینی طور پر مجھ پر روزِ روشن کی طرح یہ واضح ہونے لگا کہ میں اپنے جیون ساتھی کی حیثیت سے مسیح کے ساتھ رہنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ بلاشبہ یہ کرنا ممکن نہ تھا۔ پس اکثر اپنے آپ کو پرانی راہوں پر چلتے ہوئے پکڑ لیتی مگر میں نے کوشش میں سُستی نہ کی۔

اور اِس سلسلہ میں مَیں نے اِس وعدے کے عملی رخ کو دریافت کیا کہ پہلے تم اُس کی بادشاہی اور اُس کی راستبازی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تم کو مل جائیں گی" (متی ۶ : ۳۳) کیونکہ جونہی میں نے خدا کو اولین درجہ دینے کی کوشش کی میری کھوئی ہوئی تمناؤں کی تکمیل ہونے لگی۔

ایک بعد از دوپہر ریشیم میرے کمرے میں آئی۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ کہنے لگی "ڈرائنگ روم میں ایک خاتون مجھ سے ملاقات کی منتظر ہے۔ میں نے پوچھا "کون ہے؟"

"بیگم صاحبہ! اگر میں غلطی نہ کروں تو وہ کریم کی ماں لگتی ہے"

یقیناً وہ غلطی پر ہوگی! کریم کی ماں یہاں کیوں آنے لگی؟

میں اس پریشانی میں کہ یہ کون ہو سکتی ہے، سیڑھیوں سے نیچے اُتری مگر جونہی میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی بلاشبہ میرے مرنے والے چچازاد بھائی کی ماں سامنے کھڑی تھیں۔ میرے قدموں کی آہٹ پاکر اُس نے اُوپر نگاہ کی اور مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔

اشکبار آنکھوں کے ساتھ کریم کی ماں کہنے لگی "بلقیس شخصی طور پر آپ کو کچھ بتانے کے لئے مجھے آنا پڑا۔ پہلی بات یہ کہ جنازہ پر میں نے آپ کو دوسرے لوگوں کے درمیان نہ دیکھا۔ مگر میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میرے لئے آپ کس قدر دلاسہ کا سبب تھیں مجھے خود سمجھ نہیں آتی ... کچھ انوکھا تجربہ یہ تھا۔ کچھ خاص اور گرمجوش سا۔ اور آخر کار مجھے معلوم ہُوا کہ کریم کی ماں سے اُس وقت جبکہ وہ اِس قدر غم سے نڈھال تھی یسوع کی بات کرنے کی کیوں آزادی نہ ملی۔

کیونکہ اس سے مُراد اُس کے غم کا ناجائز فائدہ اُٹھانا ہوتا۔ تاہم اب ماحول کافی مختلف تھا۔ اپنے ڈرائنگ روم میں بڑے شائستہ انداز میں بتانے لگی کہ مجھے یسوع کس قدر عزیز ہے اور کس طرح وہ آہستہ آہستہ میرے پُرانے منہ زور طریقوں کو تبدیل کر رہا ہے اور اس کی جگہ اپنی گرما دینے والی شخصیت کو لا رہا ہے۔

میں نے اُسے باپ کہنے کی جراءت کی

کریم کی ماں کہنے لگی کہ یہ سچ ہے کہ آپ کو دوسروں کا خیال ہے۔ آپ حقیقت میں میرے غم میں شریک ہونا چاہتی تھیں۔ یہ مختصر مگر شاندار ملاقات تھی۔ دو طرح سے میری حوصلہ افزائی ہوئی۔ پہلے یہ کہ ایک اور انسان نے مجھ میں تبدیلی کو معلوم کیا اور دوسرے یہ کہ خاندانی قطع تعلق کی زنجیروں کے ٹوٹنے کا آغاز ہو گیا ہے۔

بہرحال قطع تعلقی کا جلد خاتمہ نہ ہوا۔ ہر بار جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی تو یہ کوئی مشنری ہوتا۔ لہٰذا ایک صبح محمود کے چھٹے جنم دن سے کچھ پہلے جب فون کی گھنٹی بجی تو میں نے غیر متوقع طور پر فوت ہونے والے چچا زاد بھائی کی ماں کی جانی پہچانی آواز سُنی۔

"بلقیس" "جی ہاں"۔

بلقیس میں فقط یہ کہنا چاہتی تھی کہ جو مدد آپ نے مجھے دلاسہ دینے میں کی ہے وہ قابلِ قدر ہے اُس نے مجھے بتایا کہ میرے دلاسہ سے اُس کے دل پر کیونکہ اثر ہوا۔

کس قدر دلچسپ بات تھی کیونکہ میں نے تو چند الفاظ کہے تھے یقیناً یہ مسیح تھا جس نے دلاسہ دیا تھا۔ چند مزید خوشگوار الفاظ کے بعد گفتگو اختتام پذیر ہوئی۔

اِس کے بعد ایک بار اور یسوع نے حیران کن کام کیا۔ میں نے بلاواسطہ اس سے متعلق چند الفاظ کہے یا کوئی الفاظ نہ کہا۔ میری وہاں موجودگی تھی۔ اُس کے رُوح کی نمائندگی کر رہی تھی جس کی اِس آڑے وقت میں مدد درکار تھی۔

چند ہفتوں میں چند اور رشتہ دار مختصر ملاقاتوں کے لئے آئے وہ محمود کے جنم دن پر اُس کے لئے کھلونے اور مٹھائیاں لے کر

آئے تھے۔ کھلے طور پر ان کی ملاقات کا سبب لڑکے کو دیکھنا تھا۔ حقیقت میں میں جانتی تھی کہ جسم دن ان کے لئے ایک اچھا بہانہ تھا۔ ان ملاقاتوں سے پرانے زخم ہرے ہو گئے۔ یہ ملاقاتیں مختصر اور بناوٹی تھیں۔ مگر میرے چاروں طرف اٹھی ہوئی جدائی کی دیوار میں یہ ایک سوراخ کی مانند تھیں۔

غالباً مسیح کی آواز قبول کرنے کے فیصلہ کو ایک برس ہو گیا تھا۔ وقت کس قدر تیزی سے گزر گیا تھا۔

جلد ہی پھر میرا جنم دن آ جائے گا ایک برس سے میں نے اپنے آپ کو مسیح کے حوالے کر دیا ہوا تھا۔ اور اب میں اپنے پہلے کرسمس کو منانے کی راہ دیکھ رہی تھی۔ بلاشبہ یورپ میں رہتے ہوئے میں نے کرسمس کے تہوار کو مناتے دیکھا تھا۔ مگر مجھے ہرگز معلوم نہ تھا کہ دن کو کرسمس کی حیثیت سے دیکھنے کا کیا مفہوم ہے۔ کافی دھوم دھام سے کرسمس منایا گیا۔ مچل اور سنر اولڈ کرسمس پر میرے لئے تحفے لے کر آئے جس میں کرسمس ٹری اور سجاوٹ کا نظارہ تھا۔ نوکروں نے کرسمس ٹری ڈرائنگ روم میں رکھ دیا اور کاغذ کے ربن سے اسے خوب سجا دیا۔ بایں ہمہ میں مطمئن نہیں تھی۔

تہوار کی خوشیوں سے بہت لطف اٹھایا۔ مگر ان خوشیوں میں کوئی حقیقی معنی نہیں تھے۔ میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ میں کرسمس اس طور پر مناؤں جس سے اس تبدیلی کا پتہ چلے جو میری زندگی میں آئی ہے۔

اور پھر میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ کیوں نہ ایک پارٹی کا اہتمام کیا جائے جس میں نہ صرف مشنریوں کو دعوت دی جائے بلکہ

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

گاؤں کے ہر خاص و عام مسیحی کو۔ یکایک میرے خاندان کی طرف سے خبردار کرنے والی آواز آئی کہ میں اپنے ایمان کا چرچا نہ کروں۔ اس کے ساتھ ہی تحت الشعور میں یہ آواز اُبھری اگر مجھ پر کوئی مصیبت آئی تو وہ حکومت کی سطح پر میری حفاظت نہیں کر سکے گا۔ میں جانتی تھی کہ اس طرح کی کرسمس پارٹی کا خیال بہتوں کے لئے ایک دھمکی سے کم نہیں ہوگا۔ تو بھی بہت دُعا کرنے کے بعد مجھے یوں لگا کہ جب میں نے اس غیر معمولی اجتماع کے منصوبے کا آغاز کیا تھا، خداوند کی حضوری قوی طور پر میرے ساتھ تھی۔

پس میں نے پارٹی کا اہتمام کر دیا جس سے واہ میں ہلچل مچ گئی۔ گاؤں کے لوگ وقت سے پہلے ہی جمع ہونے شروع ہو گئے۔ مشنری بھی ڈرائنگ روم میں کرسمس ٹری کے چوگرد وقت پر پہنچ گئے۔ عبادت شروع ہوئی۔ پھر اچانک ایک نوکر سے یہ سُن کر حیران ہو گئی کہ میری ایک آنٹی اور اس کے بچے بھی راولپنڈی سے مختصر ملاقات کے لئے آئے ہیں۔

میرا دل دہل گیا۔ اُن کا ردِ عمل کیا ہوگا؟ انہوں نے اُونچے درجے کے لوگوں کا سا برتاؤ کیا۔ پہلے تو اُن کے چہرے اُتر گئے۔ پھر خاموشی سے وہ ایک اور کمرے میں چلے گئے جہاں وہ غصّہ کی حالت میں خاموش بیٹھے رہے۔

اِن دو گروہوں میں سے میں کسی سے بھی بے پروائی کا برتاؤ نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے اپنا وقت ایک کمرے سے دُوسرے کمرے میں آنے جانے میں بسر کیا۔ میری حالت ایک ایسے شخص کی سی تھی جو کبھی گرم پانی کے شاور کے نیچے ہو اور کبھی سرد پانی کے شاور کے نیچے۔

بعد میں شاید میری مستقل مزاجی کے سبب سے میرے خاندان کے کچھ ممبران کا غصہ کافور ہونے لگا۔ چند ایک تو ڈرائنگ روم میں جاکر پارٹی میں بھی شامل ہو گئے۔ اختتام تک وہ مچل اور اولڈ سے بات چیت میں مشغول تھے۔

پارٹی کا ہر جگہ چرچا ہوا۔ مجھے ایک مختلف قسم کے سال کے آغاز کی اُمید تھی۔ بلاشبہ آسان نہیں مگر مختلف۔ کیونکہ اچانک میرے سامنے بہت سے چور راہے تھے۔ میرے غلط راہ اختیار کرنے سے مجھے مصیبت میں ڈال سکتے تھے۔ کیونکہ دوستوں اور رشتہ داروں کے علاوہ ایک مختلف قسم کا ملاقاتی آیا۔ اُن لوگوں کا مقصد مجھے واپس اسلام کی طرف لانا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ کچھ تماشائی اس تاڑ میں تھے کہ میں ان آوازوں کا جواب کیونکر دیتی جو مجھے واپس اسلام کی طرف لانا چاہتی تھیں۔ اب کیا مجھے خاموش رہنا چاہیئے یا اپنے دِل کی بات کہہ دینی چاہیئے؟ اب ان لوگوں سے بات کرتے وقت جب کبھی میں چالاکی سے کام لیتی تو میں بے چین اور تنہا محسوس کرتی۔ لیکن جب کبھی سوالوں کی بوچھاڑ کا جواب دوستی سے اور محبت سے دیتی تو میں محسوس کرتی کہ خداوند بذاتِ خود میرے ساتھ ہوتا۔

مثال کے طور پر ایک بعد از دوپہر دروازے پر ہلکی دستک ہوئی میں حیران تھی کیونکہ دو بجے کون آسکتا تھا۔ دروازہ کھلنے پر ریشم اندر آئی اور کہنے لگی بیگم صاحبہ! کوئی ملنے والا آیا ہے۔ اس کی نرم آواز میں ایک جھجک سی تھی۔ میں نے ریشم کو بتایا تھا کہ اچھا ہے کہ بعد از دوپہر دو سے تین بجے تک مداخلت نہ کی جائے تو بھی یہ ایک حکم نہیں تھا۔ ایک سال پہلے میں یوں کہتی کہ چاہے کچھ بھی ہو مداخلت نہ کی جائے۔ اب میں

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

نے اُسے بتایا ہوا تھا کہ میں اب وقت کو اپنا نہیں سمجھتی بلکہ وقت بھی خداوند کی ملکیت ہے۔ اگر کوئی ایسی بات ہوتی جس میں وہ بذاتِ خود خیال کرتی ہو میرا ہونا لازمی ہے۔ تو وہ بلاشبہ کسی وقت بھی کمرے میں آنے کی جسارت کر سکتی ہے۔

بیگم صاحبہ ملاقاتی انگریز ہے اور کہتا ہے کہ وہ خدا کے بارے میں بات چیت کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے اُسے بٹھاؤ میں ابھی ڈرائینگ روم میں آرہی ہوں۔ ایک انگریز میرا منتظر تھا۔ دلچسپی کا باعث تھا کہ وہ پاکستان کے قومی لباس شلوار قمیض میں ملبوس تھا۔ اطلاع دیئے بغیر آنے کی معافی چاہتے ہوئے وہ اپنے مدعا کی طرف آیا۔ کہنے لگا "میں آپ کو ملنے کی خاطر کراچی سے آرہا ہوں"۔ چونکہ اُس نے بحیثیت ایک انگریز اسلام قبول کیا تھا لہٰذا میرے خاندان کے لوگوں کو گمان تھا کہ ایک انگریز جو اسلام قبول کر چکا ہے مجھے زیادہ متاثر کرے گا۔

کھنکارتے ہوئے اور تردد کے ساتھ اُس نے اپنے بیان کو شروع کیا۔ کہنے لگا "بیگم" اُن مسلمانوں کے بارے میں جو مسیحیت کی طرف پھرتے ہیں ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ بائیبل ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ مسیحیوں کی انجیل جو خدا کی طرف سے تھی بدل دی گئی ہے۔

وہ بائیبل کے خلاف اسلام کا سب سے بڑا اعتراض بیان کر رہا تھا کہ یہ اس قدر تبدیل کر دی گئی ہے۔ موجودہ ترجمہ ناقابلِ اعتماد ہے مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ اپنی ابتدائی صورت میں یہ قرآن آج تک ہے۔

میں نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ آپ یہ گمان نہیں کریں گے کہ میں مذاق کر رہی ہوں۔ درحقیقت میں معلوم کرنے کی مشتاق ہوں۔ میں نے اکثر

سُنا ہے کہ بائیبل بدل چکی ہے۔ لیکن مجھے آج تک یہ پتہ نہیں چلا کہ اُسے کِس نے بدلا ہے۔ کب ردّ و بدل ہوا۔ کون سے حوالے تبدیل ہوئے وہ گہری سوچ میں گُم چھت کی طرف تکتا رہا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میں نے اُس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم تھا ان سوالوں کے جواب نہیں مِلتے۔

بیان کو جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا" آپ جانتے ہیں کہ میں اس تحقیق کی بنا پر بات کر رہی ہوں جو میں نے کی ہے۔

برطانوی میوزیم میں بائیبل کا قدیم نسخہ موجود ہے جو حضرت محمدؐ کی پیدائش سے تین سو برس پیشتر کا ہے۔ اسلام اور مسیحیت کے درمیان یہ قدیم نسخے ہر بات میں بائیبل کے جدید ترجمہ کے ساتھ متفق ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ہر ایک بنیادی بات میں بائیبل اپنی ابتدائی شکل میں موجود ہے شخصی طور پر میرے لئے یہ اہم ہے کیونکہ میرے لئے بائیبل خدا کا زندہ کلام بن گئی ہے۔ یہ میری رُوح سے بات کرتی ہے اور میری رُوح کی پرورش کرتی ہے۔ یہ میرے راہ کے لئے روشنی اور میرے قدموں کے لئے چراغ ہے۔

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ میں نے مزید کہا کہ یہ جاننا ضروری سمجھتی ہوں کہ کیا کوئی ایسی جگہیں ہیں جہاں میں اپنے آپ کو بیوقوف بنا رہی ہوں۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں؟

وہ کہنے لگا آپ تو کلام کی بات یُوں کرتی ہیں گویا کہ یہ زندہ ہے۔ میں نے کہا اگر کلام سے آپ کی مُراد مسیح ہے تو میرا اعتقاد ہے کہ وہ زندہ ہے۔ قرآن میں مرقوم ہے کہ کلمتہ اللہ ہے۔

وہ کہنے لگا کسی اور وقت بات ہو گی۔ اب مجھے جانا چاہیئے۔"

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

بات یہاں ختم ہوگئی۔ میں نے دروازے پر اپنے ملاقاتی کو الوداع کہا اور پھر آنے کی دعوت دے دی۔ وہ تو کبھی نہ آیا مگر اور بہت آئے جن میں کچھ ایسے تھے جو ایسی غلط فہمیوں کے سبب سے بحث میں بہت تیز تھے۔ میں اُس آدمی کو کبھی فراموش نہیں کروں گی جس نے مسیحیوں پر تین خداؤں کی پرستش کا الزام لگایا۔

کہنے لگا "آپ جسے تثلیث کہتے ہیں وہ خدا، مریم صدیقہ اور عیسیٰ علیہ السلام پر مشتمل ہے"۔ آپ مسیحیوں کا کہنا ہے کہ خدا نے مریم کو بیوی بنایا اور ان کے ملاپ سے حضرت عیسیٰ نے جنم لیا۔ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا اللہ کی بیوی نہیں ہو سکتی"۔ میں نے دل میں دُعا کی اور خیالات کا ایک سلسلہ میرے ذہن میں آیا۔

میں نے پوچھا کیا آپ قرآن پڑھتے ہیں؟ بلاشبہ میں پڑھتا ہوں۔ اچھا تو کیا آپ کو یاد ہے کہ قرآن کیونکر بیان کرتا ہے کہ مسیح خدا کے "حکم" سے پیدا ہوا۔ میں نے اکثر اس پر غور کیا کہ قرآن کیونکر ان عجیب حقائق کو بیان کرتا ہے۔ شاید آپ نے سادھو سُندر سنگھ کے بارے میں سُنا ہو جو بڑا پکا سکھ تھا اور جس پر یسوع رویا میں ظاہر ہوا۔ یسوع نے اسے تثلیث کو اس طرح سمجھایا جس طرح سورج میں گرمی اور روشنی دونوں موجود ہیں مگر تپش اور روشنی دو نہیں ہیں۔ مگر ایک ہی ہیں۔ اگرچہ اپنے ظہور میں ان کی مختلف صورتیں ہیں۔ اسی طرح مسیح اور روح القدس باپ سے صادر ہو کر دُنیا کو روشنی اور گرمی دیتے ہیں۔ تو بھی یہ تین نہیں ہیں۔ مگر ایک ہی ہیں۔ جس طرح سورج ایک ہی ہے۔

جب میں نے بات ختم کی تو کمرے میں سکوت طاری تھا میرا مہمان

گہری سوچ میں تھا۔ تھوڑی دیر بعد میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت ہوا۔

جونہی میں نے چلتے ہوئے اُس کے اُداس چہرے پر نگاہ کی تو مجھے یہ خیال گزرا کہ ان لوگوں سے یہ مختصر ملاقاتوں کو کیا خدا اپنے جلال کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔

مجھے کسی وسیلہ سے پتہ نہ چل سکا۔ کیونکہ میں نے ان میں سے کسی کے بارے میں پھر کبھی نہ سُنا۔ اِس سے کوئی فرق نہ پڑا۔ شاید مجھے نتائج کے بارے میں فکرمند نہیں ہونا چاہیئے۔ جس چیز کی ضرورت تھی وہ فرمانبرداری تھی۔ اگر خدا نے مجھے ان لوگوں سے بات کرنے کا موقع دیا تو یہی کافی ہے۔

سردیوں کے اختتام اور بہار کے آغاز میں خدائے تعالیٰ نے مجھے اور طریقے سکھائے۔ میں لاہور گئی۔ اپنے بیٹے خالد سے بات نہ کر سکی۔ آتے وقت میں نے بائیبل کی ایک سو جلدیں خرید لیں اور جو اسے پڑھنے کے مشتاق تھے ان میں تقسیم کر دیں۔

مسیحی ٹریکٹ بھی خریدے ہر موقع پہ انہیں بانٹا۔ یہ دیکھ کر کہ کئی بار لوگ اِن کی بے قدری کرتے اور ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیتے میرے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ "اے خداوند کیا یہ کام تیری مرضی کے مطابق ہے؟ میں نے یہ بھی دُعا کی کہ خداوند ابھی تک میری خدمت میں کوئی پھل نہیں لگا۔ میں نے جن جن سے مسیح سے متعلق بات کی تھی اُن میں سے کسی نے بھی مسیح کو قبول نہیں کیا تھا۔

جونہی میں نے دُعا کی حضوری بڑے زور سے کمرے میں محسوس ہونے لگی۔ یوں لگتا تھا کہ فضا اُس کی قوت اور دلاسہ سے معمور ہے

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرات کی

میں نے اپنے دل سے یہ آواز سُنی۔ "بلقیس! میں تم سے صرف ایک سوال پوچھتا ہوں! اُن موقعوں پر پھر غور کرو جن میں تم نے اپنے خاندان کے لوگوں اور عزیزوں سے گفتگو کی، اُن موقعوں پر غور کرو جن میں تم نے اُن لوگوں کو قبول کیا جو بحث کرنے کے لئے آئے۔ اِن ملاقاتوں میں کیا تم نے میری حضوری محسوس کی؟"

ہاں خداوند! ہاں یقیناً میں نے محسوس کی تھی! کیا میرا جلال وہاں موجود تھا؟ ہاں خداوند!

تو پھر تمہیں اور کیا چاہیئے۔ اپنے عزیزوں سے بات کرنے کا یہی ڈھنگ ہے۔ نجات تمہارا مسئلہ نہیں۔ تیری ضرورت فقط فرمانبرداری ہے۔ میری حضوری کی تلاش کرو نہ کہ نتائج کی۔

پس میں نے اپنا کام جاری رکھا۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ یہ کام بہت لطف اندوز بن گیا۔ خداوند نے میری آنکھیں نتائج سے ہٹا کر اپنی حضوری کی طرف لگا دی تھیں۔ اب عزیزوں سے بات کرتے وقت میں ہراساں نہیں ہوتی تھی۔ میں نے موقعوں سے فائدہ اُٹھانا سیکھ لیا۔ گفتگو چاہے سیاست پر ہوتی یا کپڑوں پر میں خداوند سے درخواست کرتی کہ وہ کوئی ایسا سوال پیدا کرے جس سے اُس کی گواہی کا موقعہ ملے۔ مثال کے طور پر ایک دفعہ جب میں اپنی بھانجی سے باتیں کر رہی تھی تو گفتگو میں میرے خاوند کی بات چھڑ گئی اب وہ جاپان میں پاکستان کے سفیر تھے۔

وہ مُسکراتے ہوئے بولی۔ اگر خالد آپ کے گھر آئے تو آپ کیا کریں گی؟ میں نے اُس کی آنکھوں میں تکتے ہوئے کہا میں اُنہیں خوش آمدید کہوں گی۔ اُن کی خدمت میں چائے پیش کروں گی میری

بھانجی نے بے یقینی کے عالم میں میری طرف دیکھا۔ بات جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا " میں نے اسے معاف کر دیا ہے۔ اور مجھے اُمید ہے کہ اُس نے مجھے اُن باتوں کے لئے جن سے میری طرف سے اُنہیں ضرر پہنچا ہے معاف کر دیا ہوگا۔

آپ اُسے اِس طرح کیونکر معاف کر سکتی ہیں! میری بھانجی جانتی تھی کہ ہم کن مشکلات سے گزر رہے تھے۔ میں نے بیان کیا کہ یقیناً اپنے زور سے اُسے معاف نہیں کر سکتی تھی۔ یسوع نے میری مدد کی ہے۔ اُس نے نفرت کے بوجھ کو مجھ سے دور کر دیا ہے۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد میری بھانجی بولی اچھا! تو یہ ہے مسیحیت جس سے میں بے بہرہ تھی۔ اگر آپ اس طرح زندگی بسر کرنے لگ جائیں تو میں پہلی ہوں گی جو آپ کے یسوع کے بارے میں سیکھنے آؤں گی۔"

یہاں بھی مجھے مایوسی ہوئی۔ مجھے بہت اُمیدیں تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ یقیناً میری بھانجی اِس موضوع پر پھر گفتگو کرے گی مگر اُس نے کبھی نہ کی۔

ایسے موقعے آئے جن کے دوران خداوند کی حضوری مجھ سے جُدا ہو گئی۔ یہ ہمیشہ اُس وقت ہوا جب شیطان مجھے قائل کر لیتا کہ میں بہت اچھی باتیں کر سکتی ہوں۔ میرے دلائل حقیقت میں کافی وزنی ہوتے تھے۔ میں نے اِس سے بھی معافی چاہی۔ میں نئے سبق سیکھ رہی تھی۔

مثال کے طور پر ایک روز میرے ایک عزیز نے مجھے پوچھا آپ الگ تھلگ کیوں رہنا چاہتی ہیں؟ آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہم

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

مسیحی ہوں، مُسلمان ہوں، ہندو ہوں، بُدھ ہوں یا یہودی ہوں، ہم ایک ہی خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ ہم اُسے مختلف ناموں سے پکار سکتے ہیں۔ اور مختلف اطراف سے اُس کی طرف جا سکتے ہیں۔ آخر کار خدا تو ایک ہی ہے۔

آپ کا مطلب ہے کہ وہ ایک پہاڑ کی چوٹی کی مانند ہے جس کی طرف بہت سے راستے جاتے ہیں؟ وہ اِس بات کو سُن کر خاموش رہ گیا۔

میں نے ایک اور حملہ کر دیا

میں کہنے لگی، ٹھیک ہے یہ مان لیا کہ خدا پہاڑ کی چوٹی کی مانند ہے۔ مگر اِس کی طرف صرف ایک ہی راستہ جاتا ہے اور وہ یسوع مسیح ہے۔ خداوند نے کہا ہے راہ اور حق اور زندگی میں ہوں۔ میں کرختگی سے کہنے لگی کہ فقط وہی ایک راہ ہے۔ میں دلائل بائیبل کے مطابق اور درست دے رہی تھی۔ مگر رُوح کی ہدایت سے نہیں میرے عزیز نے کہا کہ "بلقیس! کیا آپ کو کسی نے بتایا کہ آپ کی طبیعت میں ابھی تک گرمی ہے"۔ میں جانتی تھی کہ خدا اُس کے وسیلہ سے مجھے سکھا رہا ہے۔ میں نے خداوند سے اپنے دل میں معافی مانگی اور کہا کہ وہ میری زندگی کا قبضہ اپنے ہاتھ میں لے۔ میرا مُلاقاتی رخصت ہوا۔ نہ جانے خدا کی نزدیکی میں یا اُس سے دُور میں یہ کبھی نہیں جان سکوں گی۔ لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ میں اِن غلطیوں سے اُس کی آواز کی شنوا ہونا اور فرمانبرداری کرنا سیکھ رہی تھی۔

اور پھر ایک شب اُسی طرح کا ایک اور تجربہ ہُوا۔ جو بیشتر مسیحی ہونے کے بعد مجھے ہُوا تھا۔ میں اپنے کمرے میں سونے کی

تیاری میں تھی کہ اچانک میں نے تاریکی کی قوت کو اپنی خواب گاہ کی کھڑکی کے نزدیک محسوس کیا۔ یکایک میرا ذہن اپنے محافظ کی طرف مڑا اور مجھے کھڑکی کے قریب نہ جانے کے لئے خبردار کیا گیا۔ میں فرش پر دُعا میں دوزانو ہو گئی اور اپنے خداوند سے درخواست کرنے لگی کہ مجھے اِس طرح چھپا لے جیسے مُرغی اپنے بچوں کو اپنے پروں تلے چھپاتی ہے۔ اور میں نے اُس کی بچانے والی قوت کو محسوس کیا۔ جب میں اُٹھی تو تاریکی کی قوت جا چکی تھی۔

اگلی صُبح میں مچل کے گھر گئی۔ سورج آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ مگر میں ابھی تک خوف سے کانپ رہی تھی۔ ان کے دروازے کی طرف چلتی ہوئی میں اِس تجربہ کو بتانے میں جھجک محسوس کر رہی تھی مجھے ڈر تھا کہ شاید وہ اسے نہ سمجھ سکیں۔

دروازہ پر مسز مچل خوشی سے مجھے گلے ملیں۔ پھر ایک قدم پیچھے ہٹی۔ اُس کی نیلی آنکھوں میں سوال تھا۔ وہ پوچھنے لگی بلقیس کیا بات ہے؟ میں نے یہ کہنے کی جرارت کی کہ مجھے یہ بتاؤ کہ مسیحی ہونے کے باوجود خوفناک باتیں کیوں وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئی جہاں ہم بیٹھ گئے۔

پریشانی کے عالم میں وہ کہنے لگی " درحقیقت میں آپ کا مفہوم نہیں سمجھی" کیا کسی نے آپ کو دھمکی دی ہے؟ میں نے جواب دیا کسی انسان نے نہیں مگر غیر مرئی قوت نے۔ حیرانگی کا اظہار کرتے ہوئے وہ اپنی بائیبل لانے کے لئے اُٹھی بائیبل کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہنے لگی " افسیوں ۶ باب میں اِس قسم کی بات کا تذکرہ ہے۔" ہمیں خون اور گوشت سے کشتی نہیں کرنا ہے بلکہ

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

حکومت والوں اور اختیار والوں اور اِس دُنیا کی تاریکی کے حاکموں اور شرارت کی اِن روحانی فوجوں سے جو آسمانی مقاموں میں ہیں۔"

اُس نے میری طرف نگاہ کی۔ اُس رات کا واقعہ بیان کرتے ہوئے میں نے کہا یقیناً یہی بات ہے۔ اُس نے بڑے دھیان سے سُنا اور پھر بولی کہ آپ اِس کے بارے میں اولڈ سے کیوں بات نہیں کرتیں۔ ہنستے ہوئے میں نے کہا ٹھیک ہے لیکن مجھے پتہ نہیں کہ میں اِس معاملے کو اور طول دونگی یا نہیں۔ جب ہم عبادت کے لئے مسٹر اولڈ کے گھر میں شام کو جمع ہوں گے تو میں اِس کا ذکر نہ چھیڑنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے گمان تھا کہ بات چھیڑنے سے میں صرف احمق کہلاؤں گی۔ شاید یہ محض میرا تصور تھا۔ تاہم جونہی میں صوفے پر بیٹھے ہوئے مسز اور مسٹر اولڈ سے محوِ گفتگو تھی تو میں اِسے بیان کئے بغیر نہ رہ سکی۔

میں نے سادہ دلی سے اُسے بیان کرنے کی کوشش کی۔ میں نے کہا مسز اولڈ گزشتہ رات مجھے اِس قدر خوف ناک تجربہ ہوا کہ میں اسے بیان نہیں کر سکتی۔ اِس کا خاوند معمول کے مطابق ہمارے پیچھے کھڑکی کے قریب بیٹھے ہوئے کتاب پڑھ رہے تھے۔ مجھے سننے کے بعد اس نے اپنی کتاب ایک طرف رکھ دی اور میری بات بتانے میں جھجک کو محسوس کرتے ہوئے مجھے بڑی نرمی سے پُورا قصّہ بیان کرنے پر اُکسایا۔ جب میں نے بات ختم کر لی تو میں نے ہنسنے کی کوشش کی۔ اور کہا شاید میرے ذہن کی خرابی تھی۔ اس نے خاموش لہجہ میں کہا باتوں کا کوئی مطلب ہے۔ مافوق الفطرت باتیں ضرور ہوتی ہیں۔ وہ میرے سامنے کرسی پر بڑی سنجیدگی سے بیٹھ گیا۔

اس نے بیان کیا کہ کیونکر تاریکی کی مافوق الفطرت قوت کو خدا ہم پر آنے کی اجازت دے سکتا ہے۔ تاکہ وہ ہمارا امتحان کرے۔ مثال دیتے ہوئے مسٹر اولڈ نے پرانے عہدنامہ سے بتایا کہ کس طرح خدا نے شیطان کو ایوب پر حملہ کرنے کی اجازت دی اور کس طرح خدا نے شیطان کو اجازت دی کہ وہ بیابان میں مسیح کو آزمائے۔ کین نے بیان کیا کہ یہ دونوں آزمائشیں تھیں۔ اس نے مزید کہا کہ ہر بار جس پر شیطان نے حملہ کیا وہ اس لئے فتح مند ہوا کہ اُس کا خدا پر ایمان تھا۔ مجھے وہ تجربہ بھی یاد آ گیا جو میرے بپتسمہ لینے سے دو شب پیشتر مجھے ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ سیکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ مسٹر اولڈ کی میں شکر گذار ہوں جس نے مجھے تعلیم دی کہ خداوند مجھے تنہائی میں رہنے کا سبق سکھا رہا ہے اِس سے مجھے تسکین تھی۔

میرے خاندان کی طرف سے زیادہ قطع تعلقی کا امکان تھا۔ مگر میں ایک اور خاندان میں رہی تھی جو میرا مددگار تھا۔ واہ میں میری جڑیں کمزور ہوتی گئیں اور نئے روحانی شہر میں میری جڑیں گہری ہوتی گئیں۔

ان آزمائشوں کو برداشت کرنے کے سبب سے خداوند مجھے آہستہ آہستہ ایسی جگہ پر لا رہا تھا جہاں مجھے مکمل طور پر اُس پر اعتماد کرنا تھا۔

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

گیارھواں باب

بدلتے رُخ

اتوار کے روز دُعائیہ عبادت کے دوران مسٹر اور مسز اولڈ کو بڑی سنجیدگی سے بیٹھے دیکھ کر میں نے پوچھا کہ آپ اس قدر سنجیدہ کیوں ہیں۔ مسٹر اولڈ نے بتایا کہ وہ ایک برس کے لئے اپنے ملک جا رہے ہیں۔ میرا اولین ردّعمل بے قراری تھا۔ میں اولڈ کے بغیر کیونکر رہوں گی۔ بلاشبہ مسٹر اور مسز مچل موجود ہوں گے۔ مگر یہ دونوں خاندان میرے لئے حوصلہ افزائی کا باعث تھے۔ مچل کے خاندان کے ذریعے میں نے مسیح کو جانا تھا۔ مسٹر اور مسز اولڈ نے مجھے گہری رفاقت دی تھی۔ کیا یہ دونوں خاندانوں کی جُدائی کا آغاز تو نہیں تھا؟

مسز اولڈ میری دلی حالت کو جانتی ہوئی میری طرف آئی اور میرا ہاتھ تھام کر اشک آلود آنکھوں سے کہنے لگی پیاری بہن "اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہ کرنا کہ یسوع کے سوا تمام عزیزوں کو کسی نہ کسی مقام پر داغِ مفارقت دینا ہی ہوگا۔" مسٹر اولڈ بھی میرے قریب آ گیا۔ کہنے لگا "بلقیس بے مقصد خدا کبھی آپ کو محفوظ مقام سے نہیں نکالتا۔ اِس سبب سے دُکھ میں بھی آپ خوشی سے رہنے کا آغاز کر سکتی ہیں۔ اولڈ مچل اور میرے اکٹھے رہنے میں

صرف چند ہفتے باقی تھے۔ اُن کے جانے کا دن قریب آتا جاتا تھا۔ اِن کی جُدائی کے احساس کو دبانے کی ہر کوشش ناکام ہوگئی۔ اِن کی روانگی کے روز جب میں اُن کے گھر گئی تو غم اور دل کے بوجھ کو چھپانے کی ہر کوشش ناکام ہوگئی۔

ہم نے جرات سے الوداع کہنے کی سعی کی۔ مگر ہمارے دلوں میں ایک درد تھا۔ جب ہم نے سامان سے لدی ہوئی گاڑی کو بڑی سڑک پر چڑھتے دیکھا تو یوں لگتا تھا کہ زندگی اِس قدر خوشگوار کبھی نہ ہوگی۔ اس روز جب میں گھر کی طرف اپنی گاڑی میں آرہی تھی تو میں اِس عجیب بوجھ کے تلے دبی ہوئی تھی۔ مخالف معاشرے میں میں گویا اکیلی رہ گئی تھی۔ یہ خیالات مضحکہ خیز تھے، کیونکہ مچل بہرصورت ابھی میرے ہمراہ تھے۔

ایک صبح اِس بدلتے ہوئے سلسلہ نے غیر متوقع طور پر ایک نیا رُخ لیا۔ مسٹر اولڈ کے جانے کے چند ہفتے بعد ڈاکٹر دانی ایل بخش نے مجھے فون کیا کہتے لگے کہ وہ اور ڈاکٹر اسٹینلے ایک گروپ کی رہنمائی کر رہے ہیں جس کا نام والڈوٹرن ہے اور جس کا ہیڈ کوارٹر امریکہ کی ریاست کیلیفورنیا میں ہے۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ میں نے کبھی اس تنظیم کا ذکر نہیں سُنا تھا۔ مگر میرے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے تھے۔ حتیٰ کہ ان لوگوں کے لئے بھی یہ محض یہ جاننے کے لئے آتے تھے کہ ایک مسلمان مسیحی ہونے کے بعد کیسے لگتا ہے۔

چند روز کے بعد وہ دونوں آگئے۔ جب ہم نے کھانا ختم کیا تو ڈاکٹر اسٹینلے نے بات کا آغاز کیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ میری تبدیلی کے ساتھ ساتھ میرے یا عنبان کی تبدیلی میں بھی دلچسپی رکھتا ہے۔

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

چائے پیتے وقت وہ اپنے مدعا کی طرف آیا۔ ڈاکٹر اسٹینلے نے پوچھا میڈم شیخ! کیا خداوند کی گواہی کے لئے آپ سنگاپور چلیں گی۔ "سنگاپور"؟

ڈاکٹر بلی گراہم نے ایک بڑی کانفرنس کا اہتمام کیا ہے جس کا عنوان "مسیح ایشیا کی تلاش میں" یہ ایشیا کے تمام مسیحیوں کے لئے ہوگی۔ آپ کی گواہی ہم سب کے لئے تحریک کا باعث ہوگی۔ یہ درست نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ دُنیا کے دوسرے حصوں میں جانے کی بجائے واہ ہی میں بہت کام تھا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے" میں اِس کے لئے دُعا کروں گی"۔

ڈاکٹر اسٹینلے کہنے لگا "ضرور کیجئے"۔ پھر تھوڑی دیر میں وہ رُخصت ہو گئے۔ ڈاکٹر اسٹینلے کے رخصت ہونے کے کافی دیر بعد میں برآمدہ میں بیٹھی اِس دعوت اور دُعا کرنے کے وعدے پر غور کرتی رہی۔ میں موقع سے فائدہ اُٹھا کر جانے اور بالکل جانے کا خیال نہ کرنے کے خیالوں میں تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔

بلاشبہ میرے پاسپورٹ کی مدت ختم ہونے والی تھی۔ اگر مجھے سنگاپور جانا ہے تو اِس کی تجدید کروانی ہوگی۔ اُس وقت پاکستان میں پاسپورٹ کے بارے میں بڑی دشواریاں تھیں۔ کچھ لوگوں نے تجدید کے لئے اپنے پاسپورٹ بھیجے واپس نہ آئے۔ کیوں نہ اِس قسم کے حالات کو خداوند کی آواز پہچاننے کے لئے اِستعمال کیا جائے؟ اگر وہ چاہتا ہے کہ میں جاؤں تو وہ اِس پاسپورٹ کی حفاظت کریگا۔ اِسی بعد از دوپہر میں نے ضروری فارم پُر کر کے پوسٹ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔

غیر متوقع طور پر ایک ہفتہ کے اندر میں تجدید شدہ پاسپورٹ میرے ہاتھ میں تھا۔ چند ماہ بعد میں محمود کو الوداع کہہ کر لاہور کی طرف روانہ ہوئی۔ کراچی جانے سے پہلے اپنے بیٹے خالد سے مختصر ملاقات ہوئی۔ کراچی سے سنگاپور کے لئے طیارہ لینا تھا۔ مجھے خداوند کو جانے کوئی ڈیڑھ برس گزر گیا تھا۔ تو بھی خالد میرے باقی خاندان کی طرح اب میرے مسیحی ہونے کو خاص اہمیت نہ دیتا تھا۔ مجھے شک گزرا کہ وہ یہ خیال کر رہا تھا کہ اڑتالیس برس کی عمر میں اِس طرح ملک سے باہر جانا عجیب سا تھا۔ مگر ماں کی عزت ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے وہ کچھ نہ بولا اور ملاقات خوشگوار رہی۔

بعد میں جونہی میں کراچی سے طیارہ پر بیٹھی تو مجھے خیال ہوا کہ جس کام کو میں کر رہی ہوں، اِس کے پیشِ نظر خالد کی سوچ دُرست تھی۔ آخر سنگاپور جانے والے طیارہ پر بیٹھ کر میں کیا کر رہی ہوں؟ اِس جہاز پر بہت سے مسیحی گا رہے تھے اور خدا کی تعریف کر رہے تھے۔ میرے لئے یہ سب نیا تھا۔ اور میں اِن کی اِس خوشی سے شرمسار سی تھی۔ کیونکہ مجھے یہ کچھ مصنوعی سی خوشی لگی تھی۔ یُوں لگتا تھا کہ میرا یہ دورہ اِس زندگی کی طرف پہلا قدم تھا جو میں مستقبل میں بسر کروں گی۔

میں نے اپنے آپ سے کہا اے خداوند میں اِس لائق نہیں ہوں کہ اتنے بڑے کام کو سرانجام دوں۔ واہ میں اپنے مسیحی کردار کو ادا کرنے میں میں چین سے تھی۔ میرے لئے مسیحیت بڑی ذاتی سی خوشی تھی، جیسے میں اپنی مرضی سے دوسروں کے ساتھ شریک کر سکتی تھی۔ میں اِس خیال کو پسند نہیں کرتی تھی کہ سینکڑوں یا

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

یا ہزاروں اجنبی لوگوں میں اِس خوشی کا چرچا کروں۔

جونہی جہاز پرواز کرنے لگا میں نے کھڑکی میں سے دیکھا کہ سب کچھ دھندلکے میں پیچھے رہ گیا ہے۔ اگرچہ میں جانتی تھی کہ چند روز میں میں واپس آ رہی ہوں تو بھی کوئی چیز مجھے خبردار کر رہی تھی کہ یہ حقیقت ہے کہ یہ صرف آغاز ہے۔ اگرچہ میں جسمانی طور پر اپنے گھر لوٹ آؤں گی تو بھی ایک اور طرح سے میں کبھی واپس نہیں لوٹوں گی جہاز پر مسیحیوں کا یہ گروپ اب میرا گھر تھا۔

سندگا پور کے ایئرپورٹ سے ہم سیدھے کانفرنس ہال کی طرف گئے۔ جلسہ کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور اچانک پھر بڑی پریشانی سے میں نے محسوس کیا کہ مسیحیوں کے اِس اجتماع میں میرا رویہ مختلف تھا۔

کانفرنس ہال میں ہزاروں مرد اور خواتین تھیں۔ میں نے اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کا اجتماع کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جونہی میں ہال میں داخل ہوئی ہر ایک یہ گیت گا رہا تھا " تو ہے عظیم"۔ میں نے خدا کی رُوح کی حضوری کو انوکھے طور پر محسوس کیا۔ مسرت سے میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میں نے اتنے بڑے اجتماع کو پہلے خدا کی تعریف کرتے ہوئے کبھی نہ سُنا تھا۔ میرے لئے یہ عجیب اجتماع تھا۔ بہت سے ملکوں کے لوگ خداوند کی تعریف میں مگن تھے۔

جہاز میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے یہ سماں فرق تھا۔ اُس وقت میں نے جانا کہ جہاز میں میرے ہمراہی اِن سے فرق تھے۔ شاید وہ ڈرے ہوئے تھے۔ نئی جگہ کی وجہ سے یا شاید پرواز کے ڈر سے وہ آپس میں ایسی گفتگو کر رہے تھے جس میں رُوح کی تعریف نہ تھی۔

مگر یہاں کانفرنس میں حالات مختلف تھے۔ عام گفتگو کی بجائے پرستش کا آغاز ہو چکا تھا۔ اگر میری بلاہٹ سے مُراد اِس قسم کے لوگوں کی سنگت ہے تو مجھے منظور ہے۔ ایک بات ابھی تک مجھے ستا رہی تھی کیا واقعی ہی مجھے اِن ہزاروں لوگوں کے سامنے اُٹھ کر بولنا تھا۔ واہ میں جن لوگوں کو میں ذاتی طور پر جانتی تھی اُن کو اپنے تجربات بیان کرنا ایک الگ بات تھی۔ مگر یہاں؟ اجنبی لوگ مختلف زاویوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں بالکل محفوظ محسوس نہیں کرتی تھی۔

جلدی جلدی ہوٹل میں جا کر میں نے اپنا سامان درست کرنے کی کوشش کی۔ کھڑکی سے باہر نگاہ کرنے سے معلوم ہوا کہ سنگاپور، لندن اور پیرس سے کس قدر مختلف ہے، سڑکوں پر چلنے والی بھیڑ اور خرید و فروخت کرنے والوں کا شور مجھے بے چین کر رہا تھا میں نے جلدی سے پردا گرا دیا۔ اور کمرے کی دوسری طرف جا بیٹھی اور اپنے بے قرار دل کو دلاسا دینے لگی۔ میں نے چلاتے ہوئے کہا "اے خداوند تیرا دلاسا دینے والی رُوح کہاں ہے؟" اچانک مجھے اپنے والد کے ہمراہ واہ کی منڈی میں چلتے ہوئے بچپن کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ والد صاحب نے مجھے تلقین کی کہ میں اُس کے قریب رہوں مگر میں ہمیشہ اِس سے دُور چلی جاتی۔ ایک روز یوں ہوا کہ ایک پھُول کی خوبصورتی کو دیکھ کر میں اِس کی طرف دوڑ گئی۔

اچانک مجھے معلوم ہوا کہ میرے والد میرے ساتھ نہیں ہیں۔ افراتفری کے عالم میں میں نے اپنے والد کو پکارنا شروع کر دیا۔ میں کہنے لگی "ابّو! آ کر مجھے ڈھونڈ لو اور میں پھر آپ سے کبھی دُور نہیں ہوں گی"۔ میرے پکارنے کی دیر تھی کہ میرے والد صاحب

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

بھیڑ کو چیرتے ہوئے میرے رُوبرو آ کھڑے ہوئے۔ میں دوبارہ اُن کے ہمراہ تھی۔ اور اب میری یہی تمنا تھی کہ میں اِن کے ہمراہ رہوں۔

ہوٹل میں مقیم مجھے معلوم ہوا کہ درحقیقت بھیڑ میں نے اپنے آسمانی باپ کو چھوڑ دیا ہے۔ بلاوجہ فکرمند ہونے کے سبب سے میں اِس کی آرام دہ حضوری سے دور جا چکی تھی۔ میں نے اپنی سوچ و بچار سے توبہ کی اور اپنے آسمانی باپ کی رفاقت میں پھر سے مطمئن ہو گئی۔

میں نے شکروں کے دوران کہا "اے باپ تیرا شکر ہو"۔ برائے کرم اپنی حضوری سے دُور جانے کے سبب سے مجھے معاف فرما۔ تُو یہاں موجود ہے۔ تُو اِس ہال میں موجود ہے اور میں محفوظ ہوں۔

چند منٹ کے بعد ہوٹل کی لابی میں میں نے اپنے جاننے والے کی جانی پہچانی آواز سُنی۔ یہ ڈاکٹر اسٹینلے تھے۔

میڈم شیخ! اپنی گواہی دینے کے لئے تیار ہیں؟ میں نے اُنہیں تسلی دی کہ خداوند میرے ہمراہ ہے۔ کچھ دیر میری طرف غور سے دیکھنے کے بعد یوں لگتا تھا کہ یکایک وہ مطمئن ہو چکے ہیں۔ اور کہنے لگے بہت بہتر۔ کل صبح آپ کو اپنی گواہی دینی ہوگی۔

ڈاکٹر اسٹینلے نے مجھے اچھی طرح جان لیا تھا۔ اگلی صبح خداوند کی مدد سے میں ہزاروں لوگوں کے رُوبرو گواہی دینے کے لئے کھڑی تھی۔ گواہی دینے میں مَیں نے خداوند کی دیری کو محسوس کیا۔ یہ سچ تھا کہ بولنے والی میں نہیں تھی، بلکہ خداوند تھا۔ میری گواہی سے لوگ بہت متاثر ہوئے اور بہت سے لوگوں سے میری واقفیت ہوئی جن میں ڈاکٹر کرسٹی بھی تھے۔ جنہوں نے میری آئندہ زندگی میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ حلیم و فروتن شخص کابل

میں بیرونی ممالک کے لوگوں کا پاسبان تھا۔ اس کے کام سے متعلق گفتگو میں ہم نے خداوند کی رُوح کی تحریک محسوس کی۔

کانفرنس ختم ہونے پر میں نے واہ کی طرف اپنے گھر کی راہ لی۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ دورہ خدا کی مرضی کے مطابق تھا۔ میں نے اپنے آئندہ مشن کے لئے بہت کچھ سیکھا تھا۔ کبھی کبھار اپنے آباؤ اجداد کے گھر کو چھوڑ کر ایسے دوروں پر جانے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مجھے اِس بات کا علم نہیں تھا کہ بدلتے حالات کا رُخ مختلف تھا۔

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرات کی

بارھواں باب

بونے کا وقت

جُدائی کا دوسرا قدم اِس بُری خبر کی صورت میں آیا کہ مسٹر مچل بھی اپنے مُلک چھٹی پر جا رہے ہیں۔ اور کچھ عرصے کے بعد وہ پھر پاکستان آئیں گے۔

سنگاپور سے آنے کے ایک سال بعد کی بات ہے کہ میں اپنے علاقہ کے کچھ مسیحی بہن بھائیوں کے ساتھ مسٹر مچل کے ڈرائینگ رُوم میں بیٹھی تھی۔ یہ ملاقات مسٹر اور مسز مچل کے رخصتی سے پہلے آخری ملاقات تھی۔

مجھے اِس گھر میں پہلی آمد یاد آئی جب میں ایک متلاشی کی حیثیت سے آئی تھی۔ یہ دونوں مجھے مسیح کے پاس لائے تھے اور میرے لئے دُعائیں کرتے رہے تھے صحن میں کھڑے میں نے کہا "کیا آپ کو پتہ ہے کہ میں بُری طرح آپ کی جُدائی محسوس کروں گی"۔ اور پتہ نہیں پھر کب آپ کی ملاقات کا شرف حاصل ہو۔

مسز مچل کہنے لگی " ہو سکتا ہے خداوند آپ کو اِس کے بغیر رہنا سِکھا رہا ہو۔ بلقیس جب تک ہم فقط اُس کے بازو پر ہی تکیہ

کرنا نہ سیکھیں۔ وہ ہمیں ہمیشہ سکھاتا رہتا ہے۔ باوجود اس کے میں ان کی جُدائی پسند نہیں کرتی تھی اور میں نے مسز مچل کو یہی بتایا۔ وہ صرف ہنس دی اور کہنے لگی کہ کس کا جی چاہتا ہے کہ ماں کی گود کو چھوڑے۔ مگر اس کے آگے مہم شروع ہوتی ہے۔ آخر ان کی رخصتی کا لمحہ آ پہنچا اور بڑے تپاک سے گلے ملنے کے بعد وہ چل دیئے۔ میں تنہائی محسوس کر رہی تھی۔

اتوار کی شام کی عبادت جاری رہی۔ مگر ان کی کمی شدت سے محسوس ہوتی رہی۔ عبادتوں میں وہ جوش و خروش نہیں تھا۔

پھر ایک شام میٹنگ کے بعد میرے ذہن میں ایک خیال آیا کہ بالکل مسز اولڈ اور مچل کی ڈگر پر چلنے سے ہم غلطی پر تو نہیں ہیں؟ اگر ہمارے اندر زندگی کی کوئی نئی چنگاری نہ پیدا ہوئی تو ہمارا چھوٹا گروپ ختم ہو جائے گا۔ اس خیال سے کہ کیا ہوگا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ اچھا ہے کہ عام لوگوں کو بھی عبادتوں میں آنے کی دعوت دی جائے۔ میں نے اس طرز کی عبادت اپنے گھر کرنے کا خیال ظاہر کیا، جسے قبول کر لیا گیا۔ مختلف ذرائع سے ہم نے لوگوں کو اطلاع کر دی کہ اتوار کی شام کو میرے گھر میں مسیحی اجتماع ہوا کرے گا۔

آنے والوں کی تعداد کو دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ بہت سے راولپنڈی سے آئے تھے جیسے مجھے اُمید تھی مسیحی اور غیر مسیحی ہر طرح کے لوگ آئے۔ ہمارے ابتدائی گروپ میں سے لوگوں نے جہاں تک ہو سکی ان کی خدمت کی۔

جلد ہی رفاقت میں تازگی کا احساس نمودار ہوا۔ ذمہ داری بہت بڑی تھی۔ میں اور دیگر حضرات جو اس گروپ میں رہنماؤں کی حیثیت

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

رکھتے تھے۔ دلجوئی سے خدا کے کلام اور دُعا میں لگے رہتے۔ تاکہ کسی طرح سے ہم اِن لوگوں کی غلط رہنمائی نہ کر دیں۔ اچانک وہ وقفہ جس میں میں نے کوئی نتیجہ نہ دیکھا تھا گزر گیا۔ میں لوگوں کو حقیقت میں مسیح پر ایمان لاتے دیکھنے کا تجربہ کرنے لگی۔ خداوند کو قبول کرنے والی سب سے پہلی ایک بیوہ تھی۔ اِس نے رو رو کر خداوند کے سامنے اپنے بوجھ کو رکھا اور پھر خداوند کو اپنے دل میں آنے کی دعوت دی۔ اِس کی زندگی میں آنے والی تبدیلی غیر معمولی تھی۔ وہ غیر محفوظ اور افسردہ بیوہ سے خدا کی پُر امید بندی اور نئی مخلوق بن گئی۔ تھوڑے عرصہ بعد ایک موٹر مکینک نے خداوند کو اپنی زندگی دی۔ پھر ایک کلرک نے اور اِس کے بعد ایک خاکروب نے مسیح کو قبول کیا۔

یہ سب میرے گھر ہوا۔ حقیقت میں اِس کو میں اپنی عزت سمجھتی تھی۔ اگرچہ مجھے ڈر تھا کہ کسی وقت بھی خاندان کی طرف سے اِس کا ردعمل ہوگا۔ مگر ابھی تک کسی نے شکایت نہ کی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا تھا خاندان اُسے تسلیم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک روز ایک اینٹ سے میرا پاؤں پھسل گیا اور معمولی سی موچ آگئی۔ میرے خاندان میں سے کوئی نہ آیا۔ انہوں نے ٹیلیفون پر میری خیریت پوچھی۔ میں اِس سے خوش تھی۔ میرے خاندان کی طرف سے میری مسیحی زندگی کی مخالفت میں کمی ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی اپنے باطن سے مجھے یہ آواز آتی کہ میں ابھی تک ایک ایسی شخص ہوں جو زمین، باغ اور جائیداد کو اپنی شکست سمجھتی تھی۔

میرے گھر کے صحن میں سے ایک سڑک نوکروں کے کوارٹروں کی طرف جاتی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف بیریوں کے درخت تھے۔

گرمی کے موسم میں میری شخصیت میں تبدیلی کو بھانپ کر بچے خود بخود درختوں سے پھل توڑنے آنے لگے۔ پہلے تو یہ مداخلت ہی مجھے کافی بُری لگتی تھی۔ مگر جب بچوں کا شور میرے آرام میں مخل ہونے لگا تو میں نے مالی کو حکم دیا کہ بچوں کو بھگا دو۔ اسی روز میں نے مالی کو یہ بھی حکم دیا کہ درخت کاٹ دو۔ تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ درختوں کی بربادی کے ساتھ ہی مجھے پتہ چلا کہ میں نے کیا کیا ہے۔ درختوں کے جانے کے ساتھ ہی خداوند کا اطمینان اور اس کی حضوری بھی جاتی رہی۔

کافی دیر تک کھڑکی میں کھڑی میں اِس خالی جگہ کو تکتی رہی جہاں بیر کے درخت تھے۔ مجھے کس قدر چاہت تھی کہ کاش درخت ابھی تک وہاں ہوتے اور میں بچوں کے شور کو برداشت کر سکتی۔ میں نے پہچانا کہ پُرانی بلقیس شیخ کیسی ہے۔

ایک بار پھر مجھے معلوم ہو گیا کہ اپنی ذات میں میں خود بخود تبدیل نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف خداوند کے وسیلہ سے اور اُس کے فضل سے ہی ممکن ہے کہ مجھ میں تبدیلی وقوع پذیر ہو۔

میں نے دُعا کی کہ اے خداوند برائے کرم مجھے پھر اپنی بارگاہ میں آنے دے۔ فقط ایک کام باقی تھا۔ پھل سے لدی ہوئی شاخیں میرے باغیچے میں جا بجا بکھری پڑی تھیں۔ دوسرے روز میں نے گاؤں کے بچوں کو آ کر پھل سے لطف اندوز ہونے کی کھلی چھٹی دے دی اور وہ خوشی سے آئے۔ اگرچہ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے محتاط رہنے کی کوشش کی تو بھی پھول روندے گئے اور شاخیں ٹوٹیں۔

ایک بعد از دوپہر بچوں کے جانے کے بعد جب میں نقصان کا جائزہ لے رہی تھی تو میں نے کہا "خداوند میں سمجھتی ہوں کہ تو کیا

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

کر رہا ہے۔ شاید میں باغیچہ کو تجھ سے زیادہ عزیز رکھتی ہوں۔ یہ تیرا باغیچہ ہے۔ میں بڑی مسرت سے اسے دیتی ہوں۔ میں تیرا شکر کرتی ہوں کہ تو نے مجھے اپنی آرام دہ ذات کی طرف لانے کے لئے اسے استعمال کیا ہے۔

میری خداوند سے پھر رفاقت بحال ہو گئی۔ مگر مجھے کانٹ چھانٹ کی ضرورت تھی۔ نومیر کی ایک خنک بعد از دوپہر میں آرام کر رہی تھی کہ محمود کمرے میں آدھمکا۔ اب وہ بڑا ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے مہرے سے صاف تھا کہ وہ ایک خوبصورت نوجوان بنے گا۔ وہ مجھے بتانے آیا تھا کہ باہر ایک عورت میری ملاقات کی مشتاق ہے۔ اس کی گود میں ایک بچہ ہے۔

اپنا سر اُٹھاتے ہوئے اور ریشم اور نور جہاں کو دی ہوئی ہدایت کو فراموش کرتے ہوئے میں نے کہا "محمود" اب تم آٹھ برس کے ہو۔ آپ کو معلوم نہیں کہ دن کے اس حصّہ میں میں کسی سے نہیں ملنا چاہتی۔ محمود کمرے سے باہر گیا ہی تھا کہ مجھے خیال گزرا کہ ایسے وقت میں خداوند کیا کرتا بلاشبہ وہ فوراً اِس عورت کے پاس جاتا اور اس کی مدد کرتا میں نے محمود کو آواز دی جو ابھی قریب ہی تھا۔ وہ دروازہ میں آ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا محمود وہ عورت کیا چاہتی ہے؟ محمود کہنے لگا میرا خیال ہے کہ اِس کا بچّہ بیمار ہے۔ اور وہ ساتھ ہی کمرے میں آ گیا۔ میں اس کی آنکھوں میں اُس لگاؤ کو دیکھ سکتی تھی جو اُسے اُس عورت اور بچّے سے تھا۔ میں نے ہدایت کی کہ ٹھیک ہے اسے مہمان خانہ میں بٹھاؤ میں آ رہی ہوں۔

چند لمحوں میں محمود نے اُنہیں مہمان خانہ میں بٹھا دیا۔ وہ عورت سُتھرے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ دُور سے بچے کی دادی اماں لگتی تھی۔

اُس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ جب اُس نے اپنا چہرہ اُٹھا کر مجھے دیکھا تو اِس وقت مجھے پتہ چلا کہ وہ ایک جوان سال لڑکی ہے۔ پگھلے ہوئے دِل سے میں نے پوچھا کہ میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں؟

میں نے آپ کے بارے میں اپنے گاؤں میں سُنا اور میں پیدل چل کر یہاں آگئی ہوں۔ جس جگہ سے وہ آئی تھی وہ کوئی بارہ میل کے فاصلہ پر تھی۔ اِسی لئے بیچاری تھکی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ میں نے نوکر کو چائے اور کھانے کے لئے کچھ لانے کو کہا۔ بچّہ اگرچہ تین برس کا تھا تو بھی ماں کا دودھ پیتا تھا۔ بچّے کی حالت پر ترس آتا تھا۔ میں نے دُعا کرنے کے لئے بچّے کی پیشانی پر ہاتھ رکھا جو گرم اور خشک تھی۔

جونہی میں نے بچّے کی ماں کے سر پر دُعا کرنے کے لئے ہاتھ رکھا تو میں تصوّرات میں اپنے خاندان کی پشتوں کو اپنی اس حرکت پر کنکھیوں سے دیکھتے محسوس کیا۔ اپنی پُرانی زندگی میں میں اِس عورت کے سائے سے دُور رہتی۔ میرا دل اِس دُکھی ماں اور اِس کے بچّے کے لئے بھر آیا۔ اور میں نے خُدا سے یسوع کے نام میں اُن کی شفا کے لئے دُعا کی۔ جب خادمہ آئی تو میں نے اُسے اِس کے لئے وٹامنز لانے کو کہا۔ ہماری ملاقات گھنٹہ بھر جاری رہی۔ اِس ماں نے مجھے اپنے خاندانی زندگی کے بارے میں بتایا کہ کس طرح ایک حادثہ میں اُس کا خاوند اپاہج ہو گیا۔ اور اِس نومود بچے کے لئے کافی خوراک نہیں تھی اور اسی لئے ابھی تک وہ بچّے کو اپنا دودھ دے رہی تھی۔ کیونکہ یہ سستا طریقہ تھا۔ جب وہ جانے کے لئے اُٹھی تو میں نے اُسے اشارہ سے روکا۔ میں نے کہا میں اس بات کا بندوبست کرنا چاہتی ہوں کہ آپ کی اور اِس بچّے کی ٹھیک طور پر دیکھ بھال ہو۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی پُرانی بلقیس

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

بے قرار ہو گئی۔

اگر یہ خبر سارے واہ میں پھیل گئی کہ بلقیس کس قدر نرم دل ہے تو کیا ہوگا؟ کیا ضرورت مندوں، بیماروں اور دُکھیوں کی بھیڑ نہیں لگ جائے گی؟

اگرچہ میرے اندر سے یہ باتیں اُبھر رہی تھیں تو بھی میں مانتی تھی کہ مدد کئے بغیر کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ اس سے کچھ بھی مفہوم کیوں نہ ہو۔ جب میں نے ایک بار اپنے آپ کو اور اپنی جائیداد کو دے ہی دیا ہے تو بس۔

میں نے کہا آپ کے خاندان کو توجہ درکار ہے۔ آپ سب کو ہسپتال لے چلتے ہیں۔ اور آپ کے کھانے کا بھی انتظام ہونا چاہیئے۔ اگر آپ کے خاوند کو پھر بھی کام نہ ملے تو مجھے اطلاع دینا۔ اس کے بعد ملاقات نہ ہو سکی۔ میں نے ہسپتال میں بل کی ادائیگی کا بندوبست کر دیا۔ اور انتظار کرتی رہی کہ وہ عورت پھر آئے۔ مگر وہ عورت پھر نہ لوٹی۔ میں قدرے پریشان تھی۔ جب میں نے اس سے متعلق نوکروں سے دریافت کیا تو حسبِ معمول وہ جانتے تھے۔ وہ عورت اُس کا بچہ اور خاوند ہسپتال گئے تھے اور اب وہ بہتر تھے۔ خاوند کو کام مل گیا تھا۔ پہلے تو میری خوری نے سر اُٹھایا اور میں نے سوچا کہ کس قدر ناشکر عورت ہے۔ مگر خداوند نے مجھے اس عمل سے روکا۔ کہ کیا اس لئے تو نے اُس کی مدد کی تھی؟ اس لئے کہ وہ تیری شکر گزاری کر سکے۔

بلاشبہ میں غلطی پر تھی۔ اس عورت کی دیکھ بھال خداوند نے کی تھی نہ کہ میں نے۔ پھر میں نے خداوند سے معافی چاہی اور درخواست کی کہ وہ مجھے پھر کبھی اس طرح سے جال میں نہ پھنسنے دے۔ میں نے

آہ بھرتے ہوئے کہا " اے خداوند کتنی بار تو نے مجھے گرتے ہوئے سنبھالا ہے "۔

اُن دنوں یوں لگتا تھا کہ خداوند کے قریب رہنے کی سعی میں میں کس قدر ناکام ہوں ۔ مجھے خیال گزرا کہ کیا مسیحی زندگی کا یہی چلن ہے ۔ چونکہ اِن سوالوں کا جواب دینے والا میرے قریب کوئی نہیں تھا میں نے اِن سوالوں کو اپنے سینہ میں چھپائے رکھا ۔

ایک صبح جب نور جہاں میرے نہانے دھونے کا بندوبست کر رہی تھی تو میں نے ایک سُرخ پرندے کو دیکھتے ہوئے جو ہماری کھڑکی پر آ بیٹھا کہہ دیا کہ دیکھو خداوند نے آج صبح کیا بھیجا ہے ۔ نور جہاں میرے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی خاموشی طاری تھی جس سے میں قدرے حیران تھی ، کیونکہ عام طور پر نور جہاں بہت باتونی تھی ۔ پھر شرماتے ہوئے وہ بولی بیگم صاحبہ ! کیا آپ کو پتہ ہے کہ جب آپ خداوند کے بارے میں بات کرنا شروع کرتی ہیں ، تو آپ کے چہرے پر تبدیلی آجاتی ہے ؟

اس بعد از دوپہر میں نے اسلام آباد میں مشن شاپ پر اور کئی بائیبلوں کا آرڈر دیا ۔ یہ خاص قسم کی بائیبلیں تھیں جو بچوں کے لئے تیار کی گئی تھیں ۔ میں نے محمود سے اِس بائیبل کے مفاد کو دریافت کیا تھا ۔ میں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اِس تصویروں میں بیان کی ہوئی کتاب کو کبھی کبھی نوکر بھی شوق سے اُٹھا کر دیکھتے تھے ۔ جب بائیبلیں آگئیں تو میں نے ایک نور جہاں کو بھی دے دی ۔ مجھے کس قدر خوشی ہوئی جب وہ ایک سانس کہنے لگی بیگم صاحبہ ! مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے ۔ کیا آپ کو یاد ہے کہ اکثر آپ نے ہمیں

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

بتایا ہے کہ اگر ہم اِس یسوع کو جاننا چاہیں تو ہمیں اسے اپنے دل میں آنے کی دعوت دینی چاہیئے؟ اِس پر اُس کے آنسو بہنے لگے۔ بیگم صاحبہ میں نے ایسا ہی کیا اور وہ میرے دل میں آیا۔ میں نے اپنی زندگی بھر ایسی محبت کو کبھی محسوس نہیں کیا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ میں نے نورجہاں کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ ہم تھوڑی دیر تک خوشی سے جھومتی رہیں۔

نورجہاں تو نے کس قدر ناقابل یقین خبر سُنا دی ہے۔ اب ہم تین مسیحی ہیں، آپ ریشم اور میں۔ ہمیں اِس کی خوشی منانا چاہیئے۔ پس ریشم نورجہاں اور میں نے اکٹھے چائے پی۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ میں نے نوکروں کے ساتھ چائے پی تھی۔ مگر اِس سے پہلے مجھے تھوڑا سا دھچکا سا لگا۔ جونہی ہم تینوں چائے پیتے وقت باتیں کر رہی تھیں اور کیک کھا رہی تھیں تو ایک بار پھر میری خودی نے سر اُٹھایا۔ میرا خاندان اور عزیز اِس کا کیا رنگ چرچا کریں گے۔ وہ کس قدر حیران ہوں گے۔ میں نے اپنی پرانی راہوں پر غور کیا۔ جب میں سخت حکم صادر کرتی اور غصّہ سے پاگل ہو جایا کرتی تھی۔ کرسی پر تھوڑی سی گرد یا نوکروں کا باورچی خانہ میں تھوڑا اُونچی آواز میں گفتگو کرنا میرے غصّہ کو ہوا دینے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ خداوند یقیناً مجھ پر کام کر رہا تھا اور میں بڑی تشفی کے ساتھ اِس کی رفاقت کو محسوس کر رہی تھی۔ یہ نہیں کہ میں کوئی مقدس ہستی بننا چاہتی تھی۔ مگر میں یہ سیکھ رہی تھی کہ کس طرح میں اپنی زندگی سے اُس کی عزت کروں۔ اور کسی طور پر میرے رویہ سے اُس کے نام کی تحقیر نہ ہو۔ میں یہ بھی سیکھ رہی تھی کہ

مسیح کی گواہی دینے میں اعمال الفاظ سے بلند آواز سے بولتے ہیں۔
مگر پھر شام کی عبادتوں میں ایک عجیب بات میری توجہ کا مرکز بنی۔ نورجہاں ان درجن کے قریب دیہاتیوں میں ہمارے ساتھ شامل نہیں ہو رہی تھی۔ یہ کس قدر عجیب تھا۔ ایک روز جب وہ میرے بالوں میں کنگھی کر چکی تو میں نے اسے تھوڑی دیر رُکنے کو کہا میں نے پوچھا کہ اِس اتوار کیا تم ہمارے ساتھ شامل ہونا پسند کرو گی؟ نورجہاں چونک سی گئی اور اُس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ بس میں یہ نہیں بتا سکتی کہ میرے ساتھ کیا ہوا اور میں میٹنگ میں بھی نہیں جا سکتی۔ میرا خاوند بہت پکا مُسلمان ہے ہمارے چار بچے ہیں اگر میں کہوں کہ میں مسیحی ہو گئی ہوں تو وہ مجھے گھر سے نکال دے گا۔
میں نے زور دیتے ہوئے کہا مگر آپ کو اپنے ایمان کا اقرار کرنا ہے یہ لازمی ہے۔
نورجہاں نے افسردہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور پھر دبی زبان میں کچھ کہتی ہوئی جسے میں سمجھ نہ سکی کمرے سے باہر نکل گئی۔ شاید وہ یہ کہہ رہی تھی کہ یہ نہیں ہو سکتا۔
چند روز بعد میں بزرگ مدر رُوت کو ملنے گئی جس سے ہولی فیملی میں میری ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے اِس سے گفتگو میں ہمیشہ خوشی ہوتی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ پاکستان میں کتنے ہی چھپے مسیحی ہیں۔ چھپے مسیحی! میں نے کہا کہ مجھے سمجھ نہیں آئی کہ یہ کیونکر ممکن ہے۔ اگر آپ مسیحی ہیں تو آپ اِس کا ذکر کیوں نہیں کریں گے!
مدر رُوت کہنے لگی" ذرا نیکڈ میس کو دیکھو"
"نیکڈ میس"

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

یوحنا کی انجیل کے تیسرے باب کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ چھپا ہوا مسیحی تھا۔ پھر میں نے اپنی بائیبل کھولی اور پڑھنے لگی کہ کیونکر یہ فریسی رات کے وقت یسوع کے پاس اُس کی بادشاہت کے بارے میں مزید جاننے کے لئے آیا۔ میں نے اکثر یہ دلچسپ باب پڑھا تھا مگر اُس وقت تک مجھے پتہ نہیں چلا تھا کہ نیکدیمس ایک چھپا مسیحی تھا۔ وہ کہنے لگی شاید بعد میں نیکدیمس نے اپنے ایمان کو بیان کیا ہو۔ مگر جہاں تک کلام ہماری رہنمائی کرتا ہے وہ اِس بات میں محتاط تھا کہ اِس کے فریسی ساتھی نہ جان سکیں۔

اگلے روز میں نے نور جہاں کو اپنے کمرے میں بُلایا اور نیکدیمس کے بارے میں آیات اس کے سامنے پڑھیں۔ میں نے کہا " مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو بے چین کیا"۔ وقت آنے پر خداوند آپ کو بتا سکتا ہے کہ آپ کیونکر اپنے ایمان کا اظہار کریں دریں اثنا محض اس کی آواز کو احتیاط سے سننی ہو۔ اس کا چہرہ دمک گیا۔ بعد میں میں نے اُسے خوشی سے اپنے کام کو انجام دیتے ہوئے دیکھا میں نے خداوند سے کہا کہ مجھے اُمید ہے کہ میں نے ٹھیک بات کی ہے میں کسی پر الزام نہیں لگا سکتی تھی۔

چند ہی روز بعد میں نے خود دریافت کیا کہ دُنیا کے اِس حصّے میں مسیحی ہونا کس قدر دشوار ہے۔

ایک بعد از دوپہر فون کی گھنٹی بجی۔ یہ میرے ایک چچا تھے جو خاص طور پر میرے ساتھ سخت تھا۔ اگرچہ قطع تعلق میں قدرے نرمی تھی تو بھی اِس چچا نے کبھی بات تک نہ کی تھی۔ فون پر اُس کی

آواز کرخت تھی۔ بلقیس!

"جی ہاں"

میرے سننے میں آیا ہے کہ تم دوسروں کو گمراہ کر رہی ہو۔ تم انہیں سچے ایمان سے دُور لے جا رہی ہو۔

"چچا جی یہ تو اپنی رائے ہے"

میں تصوّر کر سکتی تھی کہ چچا کا منہ غصّہ سے سُرخ ہو گیا کیونکہ اُس کی آواز سے عیاں تھا۔ یہ ایک اور بات ہے کہ تم ایسے فیصلے کرتی پھرو مگر یہ ایک الگ بات ہے۔ دوسرے تیری پیروی کریں۔ بلقیس تمہیں یہ کام بند کرنا ہوگا"۔

چچا جی مجھے آپ کے فکر کی قدر ہے۔ مگر میں آپ کو یاد دلاؤں کہ آپ اپنی زندگی کے ذمہ دار ہیں اور میں اپنی زندگی کی۔

دوسرے ہی روز جب میرا نیا ڈرائیور مجھے ٹونی سے ملاقات کے بعد گھر کی طرف لا رہا تھا۔ ایک آدمی سڑک پر کھڑا کار کو روکنے کی کوشش میں تھا۔ میرا ڈرائیور جانتا تھا کہ میں اکثر لوگوں کو لفٹ دے دیتی ہوں۔ مگر اس بار وہ کار نہیں کھڑی کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے فیصلہ کن آواز میں کہا بیگم مہربانی سے مجھے کار کھڑی کرنے کو نہ کہنا۔ وہ اس آدمی کو بچاتا ہوا جلدی سے کار آگے نکال کر لے گیا۔ کار کے ٹائر سڑک کے آخری کنارے پر لگے۔ سیٹ سے آگے جھکتے ہوئے میں نے کہا اس سے آپ کی کیا مُراد ہے۔ آپ کا یہ خیال تو نہیں کہ وہ آدمی مشتبہ تھا؟

جی ہاں بیگم صاحبہ!

وہ خاموش رہا اور میرے سوالوں کے باوجود اُس نے کوئی اور بات نہ بتائی۔ مگر ایک ہی ہفتہ کے بعد میرے بعد از دوپہر آرام کے لئے کمرہ

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

میں آنے کے چند منٹ بعد ایک ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اِس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔

اِس نے دبی آواز میں کہا کہ مجھے اُمید ہے آپ بُرا نہیں منائیں گی۔ مگر میں آپ کو خبردار کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔ کل میرا بھائی راولپنڈی میں ایک مسجد میں تھا۔ نوجوانوں کا ایک گروپ اُس نقصان کا تذکرہ کر رہا تھا جو آپ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ وہ کچھ اقدام کرنے کی بات کر رہے تھے۔ اِس لڑکی کی آواز کانپ رہی تھی۔ کہنے لگی بیگم صاحبہ! ہمیں آپ کی فکر ہے۔ ہمیں آپ کا اور لڑکے کا ڈر ہے۔ میرا دل دہل گیا اب میری فکر کرنے کی باری تھی کہ اِس ملک میں چھُپ کر مسیحی رہنا چاہیئے یا نہیں۔ خاص طور پر اِس خاندان میں جس کی میں فرد تھی۔

تیرھواں باب

دھمکیوں کا طوفان

میرے خلاف دھمکیوں کی رپورٹ کو دو ماہ گزر گئے تھے۔ کوئی قابلِ ذکر حادثہ نہ ہوا۔ اور مجھے گمان ہونے لگا کہ خطرات کی رپورٹ بے بنیاد تھی۔ مجھے مسیح کو قبول کئے چند برس ہو چلے تھے۔ کرسمس کا تہوار قریب تھا۔

خاندان میں سے کچھ لوگ میری ملاقات کو آئے تھے مگر چچا کی طرف سے دھمکی آمیز فون مجھے یاد دلا رہا تھا کہ خاندان میں تلخی ابھی باقی ہے۔ کیوں نہ خاندان کے لوگوں اور عزیزوں کی ایک ضیافت ہو جائے۔ تاکہ پتہ چل سکے کہ کہاں تک قطع تعلقی کی خلیج کو پاٹا جا سکتا ہے۔

میں نے مہمانوں کی لسٹ تیار کی۔ میں نے حفاظت سے لسٹ اپنی بائیبل میں رکھ لی اور فیصلہ کیا کہ اگلی صبح دعوت نامے بھیج دوں گی۔ کیونکہ جب اگلی صبح میں نے لسٹ نکالنے کے لئے بائیبل کھولی تو یہ حوالہ میری نظروں کے سامنے تھا۔ لکھا تھا :۔

"جب تو دن کا یا رات کا کھانا تیار کرے تو اپنے دوستوں یا

میں نے اُسے باپ کہنے جرأت کی

بھائیوں، رشتہ داروں یا دولت مند پڑوسیوں کو نہ بُلا۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ بھی تجھے بُلائیں اور تیرا بدلہ ہو جائے۔ بلکہ جب تو ضیافت کرے تو غریبوں، لُنجوں، لنگڑوں اور اندھوں کو بُلا۔ اور تجھ پر برکت ہوگی۔ کیونکہ ان کے پاس تجھے بدلہ دینے کو کچھ نہیں اور تجھے راستبازوں کی ضیافت میں بدلہ ملے گا۔

(لوقا ۱۴: ۱۲-۱۴)

ایک ہاتھ میں بائیبل اور دوسرے میں مہمانوں کی لسٹ تھامے ہوئے میں خیال کرنے لگی کہ اے خداوند کیا میرے لئے یہ تیرا کلام ہے یہ بات صاف تھی کہ میرے رشتہ داروں اور عزیزوں میں زیادہ تعداد اُمرا کی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دی تھی کہ یہ مُسلمانوں اور مسیحیوں کا اجتماع کرنے کا اچھا موقع ہوگا۔ مگر حقیقت میں یہ میرا غرور تھا۔ میں اپنے خاندان کے سامنے اِس بات کا اظہار کرنا چاہتی تھی کہ ابھی تک امیر طبقہ میں میرے دوست ہیں۔

میں نے لسٹ کو پھاڑ دیا۔ بائیبل کے فرمان کے مطابق میں نے بیواؤں یتیموں، بے روزگاروں اور گاؤں کے غریب لوگوں کی لسٹ تیار کی اور پھر ان سب کو کرسمس کی ضیافت میں شرکت کی دعوت دی۔ اِس میں ہر ایک شامل تھا۔ حتیٰ کہ بھکاری بھی۔ کچھ دعوت نامے تو میں نے خود دیئے، اور کچھ نوکروں نے۔ نوکروں سے پتہ چلا کہ سارا گاؤں آنے کی تیاری میں ہے۔ ایک لمحہ کے لئے دل میں غلط خیال آیا میں نے اپنا قیمتی غالیچہ کے بارے میں سوچا جو میں نے تھوڑی دیر ہوئی کمرے میں بچھوایا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ اس وقت میں اِسے راستے سے ہٹا سکتی ہوں۔

تیاریاں شروع ہوگئیں۔ آٹھ برس کا محمود بڑے انہماک کے ساتھ آنے والے حضرات کے لئے تحائف اکٹھے کرنے میں مدد کر رہا تھا۔ بڑے سے لے کر چھوٹے تک ہم نے ہر ایک کے لئے تحائف لینے شروع کر دیئے۔

ایک روز دروازے پر دستک ہوئی۔ واہ کی عورتوں کا ایک گروپ باہر کھڑا ہوا تھا۔ وہ مدد کرنا چاہتی تھیں۔ ان میں سے ایک کہنے لگی۔ ہم بے لوث خدمت کرنا چاہتی ہیں۔ ہم چاہتی ہیں کہ ضیافت کے انتظام میں آپ کا ہاتھ بٹائیں۔ اچانک یہ سارا اہتمام سالے گاؤں کی برادری کا کام دکھائی دینے لگا۔ میں نے ایک کمہار کے خاندان کو پانچ سو مٹی کے دیئے بنانے کا آرڈر دیا۔ گاؤں کی عورتوں نے دیئوں کے لئے بتیاں تیار کیں۔ کام کرنے کے دوران قدرتی طور پر مسیح کے بارے میں بات کرنے کے مواقع بھی ملے۔ مثلاً جب ہم گھر میں دیئے سجا رہے تھے تو میں نے پانچ ہوشیار اور پانچ سُست کنواریوں کی کہانی چھیڑ دی۔ کھانا ایک اور دلچسپ کام تھا۔ کھانے میں بھی عورتوں نے مٹھائیاں اور لذیذ چیزیں تیار کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور چاندی کے ورق لگا کر ہر کھانا احسن طور پر تیار کر دیا گیا۔

۲۴ دسمبر کو گاؤں کے لوگوں نے آنا شروع کر دیا۔ اور یہ کوئی ایک ہفتہ بھر کی ضیافت بن گئی۔ قطار در قطار دیئے اور لوگوں کی رونق کیا ہی بھلی لگتی تھی۔ محمود گاؤں کے بچوں کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھا۔ ایک عجیب چمک تھی۔ جو ان گاؤں کے بچّوں کی آنکھوں میں تھی۔ اور محمود بہت خوش تھا۔ گھر کی رونق ایک میلہ سے کم نہ تھی۔ بار بار محمود نئی درخواستوں کے ساتھ میرے پاس آتا

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرات کی

تھا۔ مثلاً ممّی پانچ لڑکے باہر کھڑے ہیں۔ کیا اُن کو اندر بلا لیں۔ میں تھپکی دیتے ہوئے اُسے کہتی کہ بلاشبہ آپ اُنہیں بلالیں۔ یوں لگتا تھا کہ ہمارے گھر میں سارے واہ کے بچّوں کی تعداد سے زیادہ بچّے ہیں۔ جب میں نے دیہاتیوں سے بات کی کہ یسوع نے دوسروں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنے کو کہا ہے تو وہ کہنے لگے کیا واقعی وہ اسی طرح لوگوں کے ساتھ چلتے پھرتے تھے۔ میں نے کہا "ہاں" اور آج جو ہم دوسروں کے لئے کرتے ہیں ہم اُس کے لئے کرتے ہیں۔ بالآخر جب ضیافت اختتام پذیر ہوئی اور میں نے کام سے فرصت پاکر آرام سے بیٹھنے کا وقت پایا تو خُدا کا اطمینان میرے باطن میں تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ سب خداوند کی مرضی کے عین مطابق تھا۔

بہت سے غریب کبھی اس ضیافت کو نہ بھولے۔ کوئی ایک ماہ بعد میں نے نوکر سے گاؤں میں ایک جنازے کے بارے میں گاؤں کے مولوی کی بیوی نے اُونچی آواز میں یہ شکایت کی کہ بیگم صاحبہ نے اسلام چھوڑنے میں بڑی غلطی کی ہے۔ کسی اور نے اُسے جواب دیا کہ کیا آپ کی بیگم صاحبہ سے ملاقات ہوئی ہے؟ کیا آپ نے اِن کاموں میں سے کوئی کام کیا ہے جو اُس نے کئے ہیں۔

مگر اس تجربے کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہوا کہ واہ میں ایسے لوگ موجود تھے جو اس ضیافت سے خوش نہ تھے۔ ایک بزرگ مالی جو ہمارے باغ میں کام کرتا تھا ایک روز مجھے روکر کہنے لگا کہ کیا آپ مہربانی سے مجھے ایک منٹ بات کرنے

دیں گی؟ میں نے کہا بلاشبہ آپ کو حق ہے۔

بیگم صاحبہ! گاؤں میں ایک بات کا چرچا ہے جسے آپ کو جاننا لازمی ہے۔ کوئی یہ بات کرتا ہے کہ بیگم کیونکر ایک مسلہ بن گئی ہے اور گاؤں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو کہتے ہیں کہ انہیں کوئی اقدام کرنا چاہیئے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کیا کیا اقدام وہ کریں گے۔ بیگم صاحبہ میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اس کا علم ہونا چاہیئے۔ آئندہ سال میں اس قسم کی دھمکیاں گاہے بگاہے آتی رہیں۔ غالباً یوں لگتا تھا کہ میرا آسمانی باپ مجھے مشکل حالات کا سامنا کرنے کے لئے تیار کر رہا ہے۔

مثلاً ایک روز گاؤں سے تین چھوٹے لڑکے ہمارے گھر آئے۔ بعد میں مجھے گمان گزرا کہ ہو سکتا ہے کہ ان بچوں کے ذریعے خداوند اپنا پیغام مجھے دے رہا ہو۔ کیونکہ لڑکوں سے خبر سننے کے بعد محمود میرے پاس آیا۔ وہ کانپ رہا تھا اور خوف سے اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی تھیں۔ ممی کیا معلوم ہے کہ میرے دوستوں نے کیا کہا؟ وہ کہہ رہے تھے کہ گاؤں میں لوگ آپ کے قتل کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ جمعہ کی نماز کے بعد وہ یہ کریں گے۔ سسکیوں کے دوران کہنے لگا کہ اگر آپ کو قتل کر دیا تو میں بھی اپنے آپ کو ختم کر دوں گا۔

اب مجھے کیا کرنا تھا۔ میں نے محمود کو سینہ سے لگا لیا۔ اور اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اُسے تسلی دینے لگی۔ میرے پیارے بچے میں آپ کو ایک کہانی سُناتی ہوں۔ اور میں نے یسوع کے ناصرت میں پہلے وعظ کی کہانی سُنائی۔ میں نے بیان کیا

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

کہ جب لوگ غصّہ سے بھر گئے اور یسوع کو سنگسار کرنے لگے تو یسوع اُن کے بیچ میں سے گزر گیا۔ جب تک آسمانی باپ کی مرضی نہ ہوئی کوئی یسوع پہ ہاتھ نہ اُٹھا سکا۔ میرے اور آپ کے لئے بھی یہی ہے۔ ہم اُس میں محفوظ ہیں۔ کیا تمہارا اُس پہ یقین ہے؟ کیا آپ کی مراد یہ ہے کہ ہمیں کوئی ضرر نہ پہنچے گا۔

نہیں میری مراد یہ نہیں۔ یسوع کو دُکھ دیا گیا۔ مگر اسی وقت جب اُس کا دُکھ اُٹھانے کا وقت آ پہنچا۔ ہمیشہ خوف میں زندگی بسر نہیں کی۔ کیونکہ جب تک ہمارا وقت نہیں آتا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہمیں بس صبر سے انتظار کرتے رہنا اور دیکھنا ہے۔ مگر دریں اثناء ہم بڑے اعتماد سے جی سکتے ہیں۔ کیا آپ میری بات سمجھے؟ محمود نے میری طرف نگاہ کی اور اُس کی بھوری آنکھوں میں تسلّی تھی۔ اچانک وہ مُسکرایا اور خوشی سے چلاتا ہوا اپنی کھیل کود میں لگ گیا جس کا مطلب تھا کہ وہ سمجھ گیا ہے۔

میری تمنا تھی کہ میں کہہ سکوں کہ میرا یقین بھی اِسی قدر محکم ہے یہ نہیں کہ جو کچھ میں نے محمود سے کہا تھا اس پر میرا ایمان نہیں تھا۔ بات صرف یہ تھی کہ میرا ایمان ابھی تک بچوں کا سا نہیں تھا۔ میں اُٹھی اور اپنی بائیبل تھامے باغ کی طرف چل دی۔ میرا دل بوجھل تھا۔ وہ مجھے میری اپنی ہی دنفرتی سے کس طرح دور کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں۔

موسم خشک تھا۔ میں اپنی چھوٹی سی ندی میں مچھلیوں کے اُچھلنے کی آواز سُن سکتی تھی۔ دُور سے کوئل کے کُوکنے کی آواز آرہی تھی۔ گرمی کے موسم کی بچی کھچی بہار اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ یہ

دھرتی میرے اور میرے لوگوں کی تھی۔ سات سو برس تک میرے خاندان نے حسن انداز میں اس کی خدمت کی تھی۔ یہ میرا گھر ہے۔ اور اسے نہیں چھوڑ سکتی اور نہیں چھوڑوں گی۔

تو بھی ایسے حادثات وقوع پذیر ہو رہے تھے۔ جو میرے بس سے باہر تھے۔ اور میرے اپنے گھر میں ٹھہرنے کے مصمم ارادہ کے خلاف تھے۔

دسمبر ۱۹۷۰ء میں میری تبدیلی کے چار سال بعد پاکستان میں پہلا انتخاب ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ عوامی حکومت جیت جائے گی اور یہ میرے لئے اچھی خبر نہیں ہو گی۔ کیونکہ میرے عزیزوں میں سے کوئی اس جماعت کا رکن نہیں تھا۔ اس نئی جماعت کا نعرہ تھا ' اسلام ہمارا دین ہے، جمہوریت ہماری پالیسی ہے اور سوشلزم ہماری معیشت ہے۔ یہ نعرہ ایک عام آدمی کی ہمدردیاں جیتنے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ ایک عام پاکستانی قوت کے احساس کو محسوس کرتا تھا۔ کیا یہ میرے لئے بھلا تھا؟ شاید یہ نئی بلقیس کے لئے بھلا تھا۔ مگر اس میں ایک موروثی خطرہ بھی تھا۔ کیونکہ ایک سر پھرے کو یہ پتہ چل جائے کہ اس کے پیچھے حکومت کا ہاتھ ہے تو وہ ہر غلط کام کر گزرے گا۔ میں جمہوریت پسند نہیں رہی تھی سوشلزم ہماری پرانی خاندانی روایات کا منافی تھا۔ اور رہی بات اسلام ہمارا دین ہونے کی تو اس لحاظ میں میں گویا ایک غدار تھی۔

میں کچھ فاصلے سے واقعات کو دیکھتی رہی۔ ایک روز میرے باپ کے دوستوں میں سے جو پرانی حکومت میں اُن کے ساتھ رہا تھا صدر سے میرے ہاں آیا۔ میرے لئے عقیدہ پرانی برہمی کے باوجود

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

انہوں نے میرے قریب رہنے کی کوششیں کی تھیں۔ وقتاً فوقتاً فون پر اور کبھی خود آ کر میری خیریت معلوم کر لیتے۔

اب وہ ڈرائینگ روم میں میرے ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ دھیمی آواز میں بولے بلقیس کیا آپ کو کوئی خبر ہے کہ کیا ہو رہا ہے اور یہ آپ کو کیونکر متاثر کر سکتا ہے؟ کیا آپ کی مُراد پاکستان عوامی پارٹی ہے؟

بلاشبہ وہ انتخاب جیت گئے ہیں۔ آپ ذوالفقار علی بھٹو سے کہاں تک واقف ہیں؟ میں نے کہا میں اُنہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔

کیا آپ اخبار نہیں پڑھتیں اور ریڈیو بھی نہیں سُنتیں؟

نہیں! میں اِن پر وقت صرف نہیں کرتی۔

ٹھیک ہے۔ مگر میں آپ کو صلاح دوں گا کہ آپ کو حالات پر نگاہ رکھنی چاہیئے۔ حکومت کا ماحول تبدیل ہو گیا ہے۔ مجھے شک ہے کہ جس طرح آپ گزشتہ حکومتوں میں تھیں اب نہیں ہو سکتیں۔ اُنہوں نے مزید کہا کہ جو اثر و رسوخ اور عزت آپ کو پہلے اعلیٰ سوسائٹی میں ملی تھی، وہ اب مٹ چکی ہے۔ وہ دور اب جا چکا ہے۔

نصف گھنٹہ کے بعد میں نے اپنے بہی خواہوں کو الوداع کہا اور نوکر کو برتن وغیرہ اُٹھانے کو کہا۔ مجھے معلوم ہوا کہ میرے اِس عزیز کی ملاقات سے کیا عجیب بات واقع ہوئی ہے۔ یوں لگتا تھا گویا وہ خداوند کی طرف سے بول رہے تھے۔ وہ مجھے اِس حقیقت کو تسلیم کروا رہے تھے کہ میرے خیر خواہ اور اثر و رسوخ والے لوگ جا چکے ہیں۔ اِس طرح خداوند پر مکمل اعتماد کے لئے وہ مجھے ایک قدم

اور آگے لا رہے تھے۔

زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ میں نے بڑھتی ہوئی مخالفت کو بھانپ لیا۔ واہ کی گلیوں میں گھومتے ہوئے میں نے اِسے آدمیوں کی نگاہوں کو دیکھا۔ میں اُس معمولی ٹیکس آفیسر کے رویّہ میں تبدیلی کو ہرگز نہیں بھول سکوں گی۔ ماضی میں جو خادم کی طرح گفتگو کرتا تھا اب بے رُخی دکھا رہا تھا۔ میں اپنی جائیداد سے متعلق اُس سے گفتگو کر رہی تھی۔ دُرشت الفاظ اور نفرت کے انداز میں فارم میرے سامنے رکھنے سے اُس کی دُشمنی کا پتہ چلتا تھا۔

بعد میں جب میں اپنے گھر کے باہر چہل قدمی کر رہی تھی تو میں نے ایک ایسے آدمی پر نگاہ کی جو اپنی راہ سے پھر کر مجھ سے بات کرنے کے لئے کھڑا ہوا تھا۔ اب اُس کا رویّہ مختلف تھا۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے اپنا چہرہ پھیر لیا۔ اور دوسری طرف تکنے لگا۔ اپنے باطن میں ہی مجھے ہنسی آئی۔ میں نے کہا خداوند کیا ہم سب بچّوں کی سی حرکتیں نہیں کرتے؟

یہ دلچسپ بات تھی کہ نئی حکومت کا کوئی اثر میری جائیداد پر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ریشم اور نور جہاں کے علاوہ جو یسوع کو پیار کرتی تھیں میرے تمام ملازمین مسلمان تھے تو بھی ہمارے درمیان بڑی حقیقی اُلفت تھی۔ کئی بار میرے مسلمان ملازمین خاموشی سے میری خوابگاہ میں آ کر کہتے تھے کہ بیگم صاحبہ! آپ کو گھر چھوڑ کر کہیں اور جانا ہے تو آپ ہماری فکر نہ کریں۔ ہمیں اور کام مل جائے گا۔ چار برس پیشتر میرے ملازمین سے میرا رشتہ کس قدر مختلف تھا۔

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

سینے میرے مسیحی تجربہ کا ہمیشہ ایک حصّہ رہے تھے۔ خواب میں ہی پہلی بار یسوع سے ملاقات ہوئی تھی۔ اب یہ عجیب روحانی تجربات جن کا پولوس رسول ذکر کرتا ہے مزید محرّک ہو گئے۔

ایک شب کیا دیکھتی ہوں کہ میں رُوح میں اُٹھا لی گئی۔ اور میں بڑی تیز رفتاری میں سمندر پار کر رہی ہوں۔ میں ایسی جگہ آ گئی ہوں جو امریکہ میں نئے انگلینڈ کی طرح لگتی تھی۔ میں ایک گھر کے سامنے آ گئی جس میں دو بستر لگے تھے۔ ایک بستر پہ ایک بزرگ عورت پڑی تھی۔ جس کا گول سا چہرہ تھا۔ نیلی آنکھیں اور بھورے بال تھے اُس پہ ایک سفید چادر تھی۔ عورت بیمار تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اُسے کینسر ہے۔ ایک نرس کُرسی پہ بیٹھی کچھ پڑھ رہی ہے۔ پھر میں نے اپنے خداوند کو کمرے کے ایک کونے میں دیکھا میں اُس کے سامنے دوزانوں ہو کر کہنے لگی کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

وہ فرمانے لگے کہ اُس خاتون کے لئے دُعا کرو۔ پس میں اُس عورت کے پاس گئی اور بڑے جوش سے اُس کے لئے دُعا کرنے لگی۔

صبح کے وقت میں اپنے بستر پہ بیٹھی اِس خیال میں کھوئی ہوئی تھی کہ سمندر پار سے کیا مُراد ہے۔ یسوع نے مجھے اُس عورت کے لئے دُعا کرنے کو کیوں کہا؟ اِس زبردست مکاشفہ کی جھلک میرے سامنے آنی شروع ہوئی۔ ہمارے خداوند میں ہماری دُعاؤں میں بڑی قوّت ہے۔ وہ اُن کے ذریعے سے کام کرتا ہے۔ میں یعقوب کے پانچویں باب کی طرف پھری۔ جو دُعا ایمان کے ساتھ ہو گی اُس کے باعث بیمار بچ جائے گا۔ اور خداوند اُسے اُٹھا کر کھڑا کرے گا۔ اور اگر اُس نے گناہ کئے ہوں تو اُن کی بھی معافی

ہو جائے گی۔ راستباز کی دُعا کے اثر سے بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ اِس طرح ہماری دُعائیں جس کے لئے ہم دُعا کرتے ہیں۔ اُس میں خداوند کی قوت کو جاری کر دیتی ہیں۔

ایک اور وقت میں نے رویا دیکھی جس میں ایک بحری جہاز پر سوار ہو رہی ہوں میں جس کمرے میں کھڑی تھی اُس میں یسوع کھڑا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ مجھے ہدایات دے رہا تھا۔ پھر میں کمرے سے باہر آ گئی۔ راستہ کے آخر میں ایک مغربی خاتون کو دیکھا۔ وہ میری منتظر کھڑی تھی۔ وہ میرے پاس آئی اور میرے بازو میں بازو ڈال کر کسی طرف لے جانے لگی۔

میں نے منزل کے بارے میں استفسار کیا۔ مگر خداوند نے مجھے نہ بتایا۔ خواب سے مجھے یوں لگتا تھا کہ میں ایک اور دورہ پر جا رہی ہوں۔ مگر اِس دفعہ ایک نامعلوم منزل کی طرف جاؤں گی۔ مگر یسوع کی نگاہ سفر پر ہو گی۔ اِن خوابوں سے میں ذہنی طور پر تیار ہو گئی۔ اِس لئے میں کسی خبر سے ہراساں نہ ہوئی۔

مارچ ۱۹۷۱ء میں بھٹو کی حکومت کے چند ماہ بعد یعقوب جو پُرانی حکومت سے میرا واقف تھا، ملاقات کو آیا۔ سالہا سال سے وہ ہمارے خاندان کے قریب رہا تھا حقیقت میں جب میرا خاوند وزیر تھا تو ایک وقت ایسا آیا جب پاکستان کی مالی حالت گر گئی اور تجارت کا توازن بگڑ گیا۔ یعقوب اور میں نے مل کر اپنی مدد آپ کے نظریہ پر ایک پروگرام ترتیب دیا تھا۔ ہم نے سادہ زندگی بسر کرنے کا ایک منصوبہ تیار کیا۔ بنیادی تصوّر یہ تھا کہ پاکستانی صنعت کو اپنی اشیاء تیار کرنے کے لئے اُبھارا جائے

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

اور درآمدات میں کمی کی جائے۔

ملک میں اِدھر اُدھر گھوم کر ہم نے چھوٹی صنعتوں اور فیکٹریوں کو اِس پر عمل درآمد کرنے میں حوصلہ افزائی کی۔ تمام لوگوں کی ہم نے اِس بات پر حوصلہ افزائی کی کہ وہ سوتی کپڑے کی کھڈیاں لگائیں۔ اور خود کپڑے تیار کریں۔ خود ہم نے ملکی کپڑا پہن کر اِس خیال کی ترویج میں کردار ادا کیا۔ ہمارا یہ سادہ زندگی بسر کرنے کا منصوبہ کافی حد تک کامیاب رہا۔ جونہی لوکل فیکٹریاں کام کرنے لگیں پاکستان کی مالی حالت ترقی کرنے لگی۔ اِس کے بعد یعقوب صاحب اکثر میرے ساتھ سیاست اور دُنیا کے معاملات پر تبادلہ خیال کرنے کے لئے آجاتے۔ وہ ہمارے خاندان کے بارے میں کافی کچھ جانتے تھے۔ پاکستان میں جہاں جہاں ہماری جائیداد تھی وہ وہاں گیا تھا۔ اور وہ جانتا تھا کہ ہماری مالی حالت ان جائیدادوں سے وابستہ ہے۔

وہ نرمی سے کہنے لگا۔ بلقیس! کچھ دوستوں کے ساتھ میں آپ کی مالی حالت کا تذکرہ کر رہا تھا۔ کیا آپ نے اپنی زمین کا کچھ حصہ بیچنے کے بارے میں غور کیا ہے؟ مجھے یقین نہیں کہ آپ کی ساری زمین محفوظ ہے۔ جبکہ بھٹو اشتمالِ اراضی کا وعدہ کر رہا ہے۔

یعقوب نے بہت عقل کی بات کی تھی۔ وہ خطرہ سے بے پروا میری مدد کو آیا تھا۔ میں نے یعقوب کا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا کہ موجودہ حالت میں کوئی طاقت مجھے یہاں سے باہر نہیں نکال سکتی۔ بلاشبہ یہ بات بچگانہ سی تھی۔ پُرانی بلقیس اپنی جھلک

دکھا رہی تھی۔ یہ جواب اُس کی توقع کے موجب تھا۔ کہنے لگا اگر کہیں میری مدد درکار ہو تو ضرور اطلاع دینا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یقیناً اطلاع دوں گی۔

ریشم جو کہ کم گو تھی مجھے کہنے لگی، بیگم جی گزشتہ رات میں نے خوفناک خواب دیکھا۔ میں غور سے سُننے لگی۔ ریشم نے مجھے بتایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ کچھ شریر لوگ گھر میں گھس کر آپ کو قیدی بنا رہے ہیں۔ روتے ہوئے وہ کہنے لگی کہ میں ان سے خفا ہوئی۔ میں نے آپ کو پکار کر کہا کہ بیگم صاحبہ بھاگیں۔ میں نے آپ کو خواب میں گھر سے بھاگتے اور بچتے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ میں نے ہی اُسے تسلی دی۔ کیونکہ میرے لئے یہ مشکل نہ تھا جو الفاظ اُس نے کہے اُن میں میں بذاتِ خود اُس نصیحت پہ غور کر رہی تھی جو مجھے ملی تھی۔ میں نے پیار سے اس سے کہا کہ جان بچانے کے بارے میں ان دنوں خداوند سے بہت کچھ سنتی رہی ہوں۔ پہلے پہل تو میں نے یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر اب میں نے اِس پہ غور کرنا شروع کر دیا ہے۔

میں نے اُس کے زرد چہرے کو اپنے ہاتھ سے اُوپر اٹھاتے اور مُسکراتے ہوئے کہا کہ یہ ممکن ہے کہ مجھے جانا پڑے۔ مگر اگر میں جاؤں گی تو یہ خداوند کے وقت میں ہوگا۔

میں تسلیم کا سبق سیکھ رہی ہوں۔ کیا آپ کو مجھ پہ یقین ہے؟ ملازمہ خاموش رہنے کے بعد بولی " بیگم صاحبہ زندگی بسر کرنے کا یہ کس قدر شاندار طریقہ ہے"۔ یقیناً یہ ہے اور فقط یہی راستہ ہے۔ اب میرے قابو میں کچھ نہیں ہے"۔ اور اگرچہ جو کچھ میں نے

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

کہا اُس پر میرا یقین تھا تو بھی ملازمہ کے جانے کے ساتھ میں جذبات سے مغلوب تھی۔

۱۹۷۱ء کے موسم خزاں میں اور سلسلہ وار پیغام ملے اور تجربات ہوئے۔ ایک دن نور جہاں میرے پاس آئی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اور وہ جذبات سے مغلوب تھی؟ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وہ میرے بال سنوار رہی تھی۔ میں نے پوچھا

نور جہاں کیا بات ہے؟

سسکیاں لیتے ہوئے نور جہاں کہنے لگی بیگم صاحبہ میں نہیں چاہتی کہ آپ کو دُکھ پہنچے۔ کس سے دُکھ؟

آنسو خشک کرتے ہوئے وہ بیان کرنے لگی کہ میرا اپنا بھائی کل مسجد میں تھا۔ اُس نے چند آدمیوں کو یہ کہتے سُنا کہ وقت آ گیا ہے کہ آپ کے خلاف اقدام کیا جائے۔

کیا آپ کو پتہ ہے کہ اس سے ان کی کیا مُراد تھی؟

نور جہاں کہنے لگی بیگم صاحبہ نہیں! مگر مجھے ڈر ہے کہ یہ آپ کے لئے اور محمود کے لئے خوفناک ثابت ہو سکتا ہے۔ نو سالہ بچے کو وہ کوئی ضرر نہیں پہنچائیں گے۔

نور جہاں نے سنجیدگی سے کہا بیگم صاحبہ یہ وہ ملک نہیں ہے، جو پانچ سال پہلے تھا۔ اچھا ہے کہ اب محتاط رہا جائے۔

چند ہی ہفتوں بعد یہ وقوع پذیر ہو گیا۔ یہ بہت خوبصورت دن تھا۔ خزاں کا موسم تھا۔ مون سون کا موسم جا چکا تھا، اور موسم خشک تھا۔ کئی روز تک کچھ نہ ہوا۔ بعد میں میں یہ کہنے لگی کہ بہرصورت ہم جدید دور میں رہ رہے ہیں۔ یہ ۱۹۷۱ء تھا نہ کہ ۱۵۷۱ء

جب کہ مذہب کے جوش میں جنگیں لڑی جاتی تھیں۔ مذہبی جنگیں ماضی کا قصہ ہیں۔

میں دُعا کے لئے اُوپر اپنے کمرے میں گئی۔ مگر اچانک کسی وجہ کے بغیر مجھے زبردست تحریک ہوئی کہ میں محمود کو لے کر باہر گھاس کے لان میں جاؤں۔

یہ کس قدر احمقانہ فعل ہوگا۔ مگر تحریک اس قدر قوی تھی کہ میں ہال کی طرف دوڑی۔ محمود کو جو سویا ہوا تھا جگایا اور اُس کو جلدی چلنے کو کہتی ہوئی لان کی طرف چل دی۔

ابھی تک اس احمقانہ فعل سمجھتے ہوئے میں سیڑھیوں سے نیچے اُتری اور سامنے کا دروازہ کھُلا ہی چھوڑتے ہوئے باہر آ گئی۔

میری عمارت سے باہر قدم رکھتے ہی مجھے جلنے کی بُو آئی۔ میں نے ایک اصول بنایا تھا کہ میری زمین میں کوئی آگ نہیں جلائے گا۔ میں مالی کی تلاش میں گھر کی دوسری طرف جاتے ہی لرز گئی۔ مکان کی دیوار کے ساتھ کھڑکی کے پاس ایک ڈھیر کو آگ لگا دی گئی تھی۔ اور شعلے بھڑک رہے تھے۔ میں چلّائی۔ ملازم دوڑتے ہوئے آئے۔ جلد ہی اُن میں سے کچھ ندی سے پانی کی بالٹیاں لا کر آگ پر ڈالنے لگے دوسرے پانی کی نالی سے باغ میں پانی چھڑکاؤ کرنے لگے۔ مگر پانی کا دباؤ ہمارے ہاں کم تھا۔ یوں لگتا تھا کہ تمام گھر شعلوں کی لپیٹ میں آجائے گا۔ کیونکہ شعلے بہت بلند تھے اور پانی وہاں تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ دس ملازم جو اُس وقت موجود تھے۔ ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ اور ندی سے پانی لے کر شعلوں پر ڈالنے لگے۔ نصف گھنٹے کی جدوجہد کے بعد شعلے قابو میں آ گئے۔ اگر آگ نہ بجھتی تو اگلے

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

چند منٹوں میں گھر شعلوں کی نذر ہو گیا ہوتا۔

میں نے نورجہاں پر نگاہ کی اور اُس نے بڑے خوف کی حالت میں اپنا سر ہلایا۔ میں جانتی تھی کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ دھمکی پر عملدرآمد ہوا تھا۔ میں نے جلی ہوئی دیواروں اور سیاہ شہتیروں پر نگاہ کی اور یہ سوچنے سے گریز کیا کہ آگ نہ بجھنے کی صورت میں کیا ہوتا۔ میں اِس خیال سے گھبرائی کہ اگر مجھے باہر نکل آنے کی تحریک نہ ہوتی تو کیا ہو جاتا۔

ایک گھنٹہ کے بعد پولیس تفتیش کرنے آئی۔ مجھ سے، ملازمین سے سوالات کرنے کے بعد چلی گئی۔ میں اپنے کمرے میں تھی۔ میں نے بائیبل اُٹھائی کہ دیکھوں کہ خداوند کیا کہنا چاہتا ہے۔ ایک فقرہ پر میری نگاہ گویا جم کر رہ گئی۔

جلدی کر اور وہاں چلا جا کیونکہ میں کچھ نہیں کر سکتا جب تک تو وہاں پہنچ نہ جائے۔ (پیدائش ۱۹: ۲۲)

کتاب نیچے رکھتے ہوئے میں نے اُوپر دیکھا اور دُعا کی کہ اے خداوند مجھے بتا کہ چھوڑ کر جانے کی راہ کون سی ہے اور کیا یہ مشکل ہو گا یا آسان۔ اور اس بار میں نے اشک آلود آنکھوں سے دُعا کی اے خداوند لڑکے کا کیا ہو گا؟ کیا وہ بھی میرے ساتھ جائے؟ میں سب کچھ کھو چکی ہوں۔ کیا یہ بچہ بھی اِس میں شامل ہے۔

چھ ماہ بعد ایک روز مارچ ۱۹۷۲ء میں خداوند نے پھر ایک اور خواب کے ذریعے سے مجھ سے کلام کیا۔ ریشم میری طرف آئی۔ اُس کی آنکھوں میں پریشانی تھی۔

ریشم کہنے لگی بیگم صاحبہ کیا کیش بکس محفوظ ہے؟

اُس کا اشارہ اُس چھوٹے بکس کی طرف تھا جس میں میں گھر کی ضروریات کے لئے رقم رکھتی تھی ۔ یقیناً بکس محفوظ ہے
پر معاملہ کیا ہے ؟
ریشم نے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا مجھے گزری رات ایک خواب آیا جس میں آپ موٹر پر ایک لمبے سفر پر جا رہی ہیں ۔ کیش بکس آپ کے ساتھ ہے ۔ ہاں یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی ۔ کیونکہ میں اکثر کیش بکس اپنے ساتھ رکھتی تھی ۔ ریشم نے مزید کہا کہ خواب بڑی حقیقی تھی ۔ اور افسوسناک حصّہ یہ تھا کہ جب آپ سفر کر رہی تھیں تو لوگوں نے آپ کو روکا اور آپ کا بکس چھین لیا گیا ۔
وہ لرز گئی ایک بار پھر مجھے اُس کو یوں تسلی دینی پڑی کہ پیسے کا کھو جانا مجھے خدا پر زیادہ اعتماد کرنا سکھائے گا ۔ جب وہ اپنے کام کی طرف لوٹ گئی تو میں نے خواب کے بارے میں غور کیا ۔ کیا یہ پیشگوئی ہو سکتی ہے ؟ کیا مجھے اِس بات کی خبر دی گئی تھی کہ میرا مال لُٹ جائے گا ۔ کیا جلد ہی بذاتِ خود میں کسی مالی سہارے کے بغیر اپنی نامعلوم منزل کی طرف چل دوں گی ؟
یہ پریشان کن دن تھے ، کیونکہ محض دو ماہ بعد جولائی ۱۹۷۲ء کے گرم دن میں ایک ملازم نے مجھے خالد کے آنے کی اطلاع دی ۔
میرا بیٹا خالد ابھی تک لاہور میں ہی رہتا تھا ۔ اِس قدر گرمی میں آخر وہ کیوں آیا ؟ ایسی اہم بات کیا تھی جو ٹیلیفون پر طے نہیں ہو سکتی تھی ؟
خالد ڈرائنگ روم میں میرا انتظار کر رہا تھا ۔ کمرہ کے اندر داخل ہوتے ہی میں کہنے لگی میرے لال میں آپ کی صورت دیکھ کر

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

مسرور ہوں۔

"مگر تم نے فون کیوں نہ کیا؟"

خالد نے آگے بڑھ کر مجھے چوما۔ اُس نے ڈرائینگ روم کا دروازہ بند کر دیا۔ اور اپنے آنے کا مقصد بیان کرنا شروع کر دیا۔ "امی جان میں نے ہولناک افواہیں سنی ہیں" وہ رُک گیا۔ میں نے مُسکرانے کی کوشش کی۔ خالد نے اپنی آواز قدرے کم کر کے بیان جاری رکھا۔ امی حکومت بہت سی پرائیویٹ جائدادوں کو قبضہ میں لے رہی ہے میرا ذہن میرے حکومت کی طرف سے اُس عزیز کی طرف چلا گیا جس نے ایک برس پیشتر مارچ ۱۹۷۲ء میں یہی بات کہی تھی۔ کیا اب اُس پیشگوئی کے پورے ہونے کا وقت تھا؟ خالد نے بتایا کہ اشتمالِ اراضی کے زیرِ اثر کافی امکان ہے کہ ہماری جائداد ان پہلی جائیدادوں میں ہو جو حکومت لے گی۔

میں نے پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ میں کیا کروں؟ کیا وہ ساری کی ساری جائیداد پر قبضہ کر لیں گے یا جائیداد کا کچھ حصہ لیں گے؟ خالد اپنی کرسی سے اٹھا اور خیالات میں مستغرق باغ کے دریچہ کی جانب گیا۔ میری طرف مڑتے ہوئے کہنے لگا "امی جان" کسی کو اِس کا علم نہیں ہے۔ شاید آپ کی جائیداد کا کچھ حصہ تھوڑا تھوڑا کر کے بیچنا عقلمندی ہو۔ اس سے خریدار گورنمنٹ کے قبضہ سے محفوظ رہے گا۔

جُوں جُوں میں نے اِن پر غور کیا، مجھے خالد کی تجویز درست لگی۔ اِس سلسلہ میں بات چیت کے لئے ہم سب ٹرنی کے پاس گئے۔ ہم سب متفق تھے کہ یہ درست اقدام ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ خالد لاہور

روانہ ہوگا۔ اور ہم کاغذی کارروائی مکمل کرنے کے لئے اِس سے جا ملیں گے۔

۱۹۷۲ء کی ایک گرم صبح ٹونی محمود اور میں لاہور میں جائداد کے معاملے کو طے کرنے کے لئے تیار تھے۔ جونہی میں نے گھر سے قدم نکالا اپنے باغ کی خوبصورتی کو دیکھ کر مجھے افسوس ہوا۔ گرمیوں کے پھول اپنا جوبن دکھا رہے تھے۔ چشمے معمول سے بھی زیادہ بلندیوں کو چھو رہے تھے۔

سامنے والے دروازے پر جمع ملازمین سے میں نے کہا کہ چند ہفتوں میں ہم واپس آجائیں گے۔ ہر ایک نے اِس خیال کو تسلیم کیا۔ صرف نورجہاں اور ریشم خوش نہیں تھیں۔ اچانک نورجہاں آنسوؤں سے رونے لگی اور وہاں سے چلی گئی۔ میں خوابگاہ میں کچھ لینے واپس گئی۔ جب سیڑھیوں سے نیچے جانے کے لئے میں ہال کی طرف مڑی تو ریشم میرے سامنے کھڑی تھی۔ اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔

بڑی دھیمی آواز میں کہنے لگی بیگم صاحبہ! خدا آپ کے ساتھ رہے۔ میں نے کہا آپ کے ساتھ بھی رہے۔

ریشم اور میں دونوں ہال میں خاموش کھڑی تھیں۔ ہم کچھ نہیں کہہ رہی تھیں۔ مگر ہر بات سمجھ رہی تھیں۔ کسی نہ کسی طرح سے مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں اُس کی صورت پھر نہ دیکھوں گی۔ میں اُس کے بہت قریب آچکی تھی۔ میں نے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے خاموش لہجہ میں کہا آپ کی طرح کوئی میرے بال سنوار نہیں سکے گا۔

ریشم نے اپنے ہاتھ اپنے منہ پر رکھے میرے پاس سے چلی گئی۔

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

میں نے اپنی خواب گاہ کا دروازہ بند کرنے ہی والی تھی۔ کسی قوت نے مجھے روک دیا۔ میں واپس کمرے میں گئی اور وہاں کھڑی رہی۔ سفید دیواروں پر موت کا سا سکوت طاری تھا۔ صبح کے سورج کی کرنیں کھڑکی میں سے جھانک رہی تھیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں میں نے اپنے خداوند کو جانا تھا۔ میں نے اپنے کمرے اور باغ کی طرف سے منہ پھیر لیا اور کار کی طرف چل دی۔ اِس باغ میں کتنی بار میں نے خداوند کی حضوری کو محسوس کیا تھا۔

لاہور میں کچھ لوگ تھے جنہیں دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو جائے گا۔ بلاشبہ خالد اُس کی بیوی اور اُن کی جواں سال بچی کو مل کر میرا دِل کھِل جائے گا۔ مسز اولڈ سے ملاقات کا بھی امکان تھا۔ میں نے لکھا تھا کہ میں لاہور آ رہی ہوں۔ اِس کانیاکام قصبہ سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں میں تھا۔ مگر مجھے اُمید تھی کہ اُن پرانے عزیزوں سے ملاقات ہو گی۔ لاہور معمول کے مطابق جولائی کے مہینے میں بارشوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ سڑکیں پانی سے بھری ہوئی تھیں۔

اپنی مجبوریوں کے سبب سے ٹونی بہت کم ہمارے ساتھ ٹھہر سکی کاغذی کارروائی مکمل کرنے کے بعد ہم نے ٹونی کو ریل گاڑی پر راولپنڈی جانے کے لئے الوداع کہدیا۔ پلیٹ فارم پر عجیب دلخراش منظر تھا۔ پروگرام کے مطابق چند دنوں میں محمود پھر اپنی امّی سے جا ملے گا۔ تو بھی اِس جُدائی کا ایک غیر معمولی سا احساس تھا۔ محمود اب دس برس کا تھا۔ اپنی ماں سے الوداعی بوسہ لیتے وقت اُس نے بمشکل اپنے اشکوں کو روکا۔ لڑکے کو بازوؤں میں لیتے ہوئے ٹونی اُونچی آواز میں روئی۔ ٹونی کو گلے ملتے ہوئے میں بھی رو رہی تھی۔

اچانک ٹونی بولی اب بس بھی کیجئے۔ ہم کوئی ماتم تھوڑا کر رہے ہیں۔ میں مسکرائی پھر اُسے چوما۔ میں اور محمود اُسے گاڑی پر روانہ ہوتے دیکھ رہے تھے۔ گاڑی اسٹیشن سے روانہ ہوئی اور ہم ہاتھ ہلاتے رہ گئے۔

جو ہماری جائیداد بیچ رہے تھے انہوں نے کہا کہ جائیداد کے فروخت کرنے میں چند ہفتے لگیں گے۔ خالد نے ہمیں یقین دلایا کہ جتنی دیر ہم چاہیں ہم اُس کے ہاں ٹھہر سکتے ہیں۔

ایک بات جو میری بے چینی کا سبب تھی وہ یہ کہ میں یہاں روحانی رفاقت سے محروم رہوں گی۔ مسیحیوں کو روحانی طور پر زندہ رہنے اور تحریک دینے کے لئے ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔

میں نے مسز اولڈ کو فون کیا۔ مسز اولڈ کی آواز سُن کر بڑی خوشی ہوئی۔ ہم نے فون پر دُعا کی۔ خوشی اور غم کے ملے جُلے جذبات تھے۔ مصروفیات اُن کے لاہور آنے میں حائل تھیں۔ تو بھی وہ قصبہ میں کسی مسیحی سے واقفیت کروا سکتے تھے۔ مسز اولڈ نے خاص طور پر ایک پروفیسر کی بیوی بیگی کا ذکر کیا۔ عجیب طور پر یہ نام سُن کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

چند منٹوں میں فون پر بیگی سے بات کر رہی تھی۔ اگلے چند گھنٹوں میں وہ خالد کے ڈرائینگ روم میں تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکراہٹ سے اُس کا چہرہ کھل اُٹھا۔

کہنے لگی " بیگم شیخ " مجھے بتاؤ کہ کیا یہ سچ ہے کہ آپ کی پہلی ملاقات یسوع سے خواب میں ہوئی تھی؟ آپ نے خداوند کو کیسے جانا؟

میں نے اُسے باپ کہنے کی جراءت کی

پس ڈرائنگ روم میں میں نے پیگی کو سارا قصہ سُنایا۔ چھ برس ہوئے اِس داستان کا آغاز ہوا تھا۔ پیگی نے بڑے انہماک سے میری کہانی سُنی۔ جب میں نے کہانی ختم کی تو اُس نے میرا ہاتھ تھام کر بہت ہی حیران کن بات کہی۔

میری خواہش ہے کہ آپ میرے ساتھ امریکہ چلیں۔ میں نے حیرانگی سے اُس پر نگاہ کی۔ میرا دل دھڑک رہا تھا پیگی کہنے لگی کہ سنجیدگی سے یہ کہہ رہی ہوں۔ میں جلد اپنے بیٹے کو اسکول میں داخل کروانے کے لئے جا رہی ہوں۔ میں چار ماہ تک امریکہ میں رہوں گی۔ آپ میرے ساتھ سفر کرتی ہوئی ہمارے کلیسا میں گواہی دے سکتی ہیں۔

وہ اِس قدر خوش تھی کہ میں اُس کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ میں آپ کی دعوت کی قدر کرتی ہوں مگر مجھے اِس کے بارے میں دُعا کرنے کا موقع دیں۔

اگلی صبح ملازمہ میرے لئے ایک پیغام لائی۔ میں نے اُسے پڑھا اور ہنسی یہ پیگی کی طرف سے تھا۔ کیا ابھی تک آپ نے دُعا کی ہے یا نہیں؟

میں مسکرائی کاغذ کو پھینک دیا۔ کیونکہ اِس پر مزید غور کرنے کا ابھی وقت نہیں تھا۔

گزشتہ دو برس کے حالات فلم کی طرح میرے ذہن کی سطح پر اُبھرنے لگے۔ خواب، دھمکیاں اور آگ کا حادثہ اور پھر میں نے مصمم ارادہ کیا کہ خداوند کی مرضی ہوگی میں وہی کروں گی۔ اگرچہ اِس میں مجھے اپنا وطن بھی کیوں نہ ترک کرنا پڑے۔

میں نے بیگی کے سوال کو ابھی تک خداوند کے سامنے نہیں رکھا تھا۔ مگر اب میں اُسے خداوند کے سامنے رکھوں گی۔ میں نے اس دورہ کو خُدا کے ہاتھ میں دیا۔ میرے لئے سمجھنا مشکل تھا۔ کیونکہ مجھے یہ سوچ آرہی تھی۔ اگر یہ چار ماہ کا دورہ نہ ہوا تو یہ آخری دورہ ہو جائے گا۔

اے خداوند میں ایک بار پھر کہوں گی کہ تو جانتا ہے کہ میں کس قدر اپنے وطن میں رہنے کی مشتاق ہوں۔ بہرحال میں اب باون برس کی ہوں۔ اور یہ از سرِ نو زندگی کے آغاز کا وقت نہیں ہے۔

مگر میں نے آہ بھرتے ہوئے کہا کہ یہ سب سے اہم بات نہیں ہے۔ سب سے اہم بات اے خداوند تیری حضوری میں رہنا ہے۔ اے خداوند کرم فرما کر میری مدد کر میں ایسا فیصلہ کبھی نہ کروں جو مجھے تیری حضوری سے محروم کر دے۔

چودھواں باب

نئی منزل

یہ عجیب بات تھی کہ جونہی خداوند نے پاکستان چھوڑنے کے لئے میرا ذہن تبدیل کیا راستے میں رکاوٹیں آنی شروع ہو گئیں۔ مثال کے طور پر ایک رکاوٹ جو ناقابلِ حل لگتی تھی کہ پاکستان کا شہری اپنا ملک چھوڑتے وقت پانچ سو ڈالر سے زیادہ رقم اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ میرے ہمراہ محمود دو سو پچاس ڈالر لے جا سکتا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ میں اور محمود چار ماہ تک ساڑھے سات سو ڈالر میں کیونکر گزارہ کر سکیں گے۔ اس سبب سے پیگی کی تجویز پر مزید غور کرنے سے میں رُکی رہی۔

پھر چند روز بعد پیگی نے ایک روز مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ باتوں ہی باتوں میں ڈاکٹر کرسٹی ولسن کا ذکر چھڑ گیا۔ وہ اُسے بھی جانتی تھی۔ جب سے میں نے یہ سُنا تھا کہ افغان حکومت نے اُس چرچ کو مسمار کر دیا ہے جو اُس نے بیرونی لوگوں کے لئے تعمیر کروایا تھا تو میں اس کے بارے میں سوچا کرتی تھی۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ کو پتہ ہے کہ وہ اب کہاں ہے؟ پیگی کہنے لگی

ٹھیک طرح سے مجھے معلوم بھی نہیں۔

اسی لمحہ فون کی گھنٹی بجی۔ بیگی فون سننے گئی وہ واپس آئی تو اس کی آنکھیں حیرت زدہ تھیں "کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ کون تھا؟ یہ ڈاکٹر کرسٹی ولسن تھے۔"

ان حیران کن واقعہ پر ہنسی پر قابو پاتے ہوئے ہم نے اپنے آپ سے سوال کرنا شروع کیا یہ محض اتفاق ہی تھا! بیگی کہنے لگی کہ ڈاکٹر ولسن لاہور سے گزر رہے ہیں وہ ملاقات کے لئے آنا چاہتے ہیں۔ میں خوش تھی۔ کیونکہ حالات سے بخوبی واقف ہو جاؤں گی۔ مگر نہ جانے مجھے یہ احساس کیوں ہو رہا تھا کہ یہ ایک عام ملاقات سے قدرے بڑھ کر ہو گی۔

اگلے روز ملاقات سے بہت خوش ہوئی۔ میں نے واہ کے واقعات اور اپنی زندگی کے بارے میں ڈاکٹر کرسٹی کو سارا قصہ کہہ سنایا۔ پھر بیگی نے بتایا کہ وہ کیونکہ مجھے امریکہ جانے کی دعوت دے رہی ہیں۔ اس خیال میں اس نے کافی دلچسپی دکھائی شروع کر دی بیگی کہنے لگی کہ اگرچہ کئی مشکلات ہیں۔ اور ان میں سے پہلی یہ ہے کہ بلقیس ملک سے صرف پانچ سو ڈالر اپنے ساتھ لے جا سکتی ہے ڈاکٹر کرسٹی کہنے لگا کہ میں اپنے ایک دوست کو جو کیلیفورنیا میں ہے تار بھیج سکتا ہوں۔ شاید وہ کچھ کر سکے۔

چند روز بعد بیگی نے فون کیا وہ بہت خوش تھی۔ چلاتے ہوئے کہنے لگی بلقیس! تمام بندوبست ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر بوب پیرز آپ کی اسپانسر شپ بھیجنے کو تیار ہیں۔ کیا آپ سات روز کے اندر اندر جانے کے لئے تیار ہو سکتی ہیں؟

میں نے اُسے باب کہنے کی جرارت کی

سات روز کے اندر! اچانک اپنے وطن کو چھوڑنے کا بہت بڑا خطرہ میرے سامنے آگیا۔ کیونکہ میں ابھی تک سُستی کر رہی تھی کہ اگر میں نے اپنا ملک چھوڑا تو یہ ہمیشہ کے لئے ہوگا۔

مجھے ایک شاعر کے یہ الفاظ یاد آگئے۔ "خدا نے سب آدمیوں کو ساری دھرتی پیار کرنے کے لئے دی۔ مگر چونکہ ہمارے دلوں کی وسعت تنگ ہے اِس لئے ہم ایک خطہ میں بھی ٹھیک طرح رہنے کا ثبوت دے سکتے ہیں۔ اور وہی خطہ سب سے پیارا ہو سکتا ہے"

(روڈ یارڈ کپلنگ)

میرے ذہن میں واہ، میرا باغ، میرا گھر اور خاندان گھومنے لگا کیا میں اِنہیں چھوڑ سکوں گی؟

اگر میں حقیقت میں قائل ہو جاؤں کہ یہ خُدا کی مرضی ہے تو مجھے یہ سب کرنے میں مضائقہ نہیں، کیونکہ میں جانتی تھی کہ دیدہ دانستہ نافرمانی کا نتیجہ کیا ہوگا۔ خُدا کی حضوری جُدا ہو جائے گی۔

اگلے چوبیس گھنٹوں میں ایک اور تصدیق آگئی۔ خالد نے شام کے کھانے پر بتایا کہ فقط ایک چھوٹی سی بات باقی ہے۔ اور اس کے بعد جائیداد کا سارا معاملہ طے ہو جائے گا۔ خالد کہنے لگا ممی! میرا خیال ہے جس جائیداد کو آپ بیچنا چاہتی تھیں اُس سے آپ کی خلاصی ہوگئی ہے۔ پھر اچانک دروازہ گویا بند ہوگیا۔

یوں لگتا تھا کہ خدا کی طرف سے نہیں بلکہ میرے ملک کی طرف سے کیونکہ ابھی ایک قانون درمیان میں تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ کوئی پاکستانی اُس وقت تک اپنا ملک نہیں چھوڑ سکتا جب تک اُس کا سارا ٹیکس ادا نہ ہو۔ میرا انکم ٹیکس تو ادا کر دیا گیا تھا مگر

مجھے اُس کی مفصل نقل درکار تھی۔ مجھے انکم ٹیکس کی ادائیگی کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا تھا۔ اُس کے بعد ہی میں امریکہ کے لئے ٹکٹ خرید سکتی تھی۔

میری روانگی کے سات روز میں سے چار روز گزر چکے تھے صرف تین روز باقی تھے۔ جب میں اور میرا بیٹا خالد ٹیکس کی ادائیگی کا سرٹیفکیٹ لینے کے لئے حکومت کے دفتر میں داخل ہوئے تو ہمارا خیال تھا کہ کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہوگا۔ کیونکہ میرے کاغذات مکمل تھے۔

دفتر لاہور کی ایک پُررونق سڑک پر واقع تھا۔ دفتر میں داخل ہونے سے سارا منظر اجنبی سا دکھائی دیا۔ معمول کے مطابق یہاں بہت شور شرابا ہوتا ہے۔ مثلاً کلرکوں کی اِدھر اُدھر کی دوڑ دھوپ اور کاؤنٹر پر کھڑے لوگوں کی آفیسرز سے بحث معمول ہوتا تھا۔

صرف میں اور خالد ہی دفتر میں تھے۔ بالوں سے بے نیاز ایک کلرک جو کاؤنٹر کے آخری کونے پر بیٹھے ایک میگزین پڑھ رہا تھا آگے بڑھ کر میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔

بے پرواہی سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا کہ مجھے افسوس ہے یہاں ہڑتال ہے۔ ہڑتال!

وہ کہنے لگا جی ہاں ہڑتال ہے۔ کوئی بھی ڈیوٹی پر نہیں ہے۔ اور آپ کے لئے کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ میں کچھ دیر تک اُس آدمی کو تکتی رہی۔ پھر میں چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے اِس قدر بلند آواز سے دُعا کی جسے صرف خالد ہی سُن سکتا تھا۔ کہ "اے

میں نے اُسے باپ کہنے کی جراءت کی

خداوند کیا تو نے دروازہ بند کر دیا ہے؟ مگر اب تک تو نے میری اِس معاملے میں حوصلہ افزائی کیوں کی ہے؟

پھر مجھے ایک خیال آیا کہ کیا اُس نے واقعی دروازہ بند کر دیا تھا میں نے دُعا کی کہ "اے باپ ٹھیک ہے اگر یہ تیری رضا ہے کہ میں اور محمود امریکہ جائیں تو ہماری صفائی کے کاغذات کا خود بندوبست کر۔" میں نے ایک زبردست اعتماد محسوس کیا۔ اور کلرک سے مخاطب ہوئی۔ میں نے کہا لگتا ہے کہ آپ ڈیوٹی پر ہیں۔ آپ مجھے صفائی کے کاغذات کیوں نہیں دیتے؟ اُس نے اپنے میگزین سے نگاہیں اُٹھاتے ہوئے غصہ سے میری طرف دیکھا۔ وہ اِس قسم کا آدمی معلوم ہوتا تھا جسے کسی کا کام نہ کرنے میں خوشی ہوتی تھی۔ غصہ سے بولا محترمہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے کہ ہڑتال ہے۔

میں نے کہا ٹھیک ہے، تو پھر مجھے آفیسر سے ملنے کی اجازت دیں میں نے اپنی حکومت میں ایک بات سیکھی تھی کہ جب میں کسی کام کو کروانے کا مصمم ارادہ کر لیتی تو میں اعلےٰ افسروں تک پہنچتی تھی۔

کلرک نے اپنے میگزین کو رکھ دیا اور مجھے لے کر اپنے قریب ہی دفتر میں گیا۔ رُوکھے پن سے بولا کہ یہاں انتظار کرو۔ اور پھر خفگی میں نظروں سے غائب ہو گیا۔ میں نے اندر سے مدھم گفتگو کی آواز سُنی۔ اور پھر وہ آدمی باہر آیا اور مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

میری اور خالد کی ملاقات ایک ادھیڑ عمر خوبرو آدمی سے ہوئی۔ میں نے اپنی ضروریات بیان کیں۔ وہ کرسی کی ٹیک لگا کر کچھ سوچتا رہا۔ اور پھر بولا "محترمہ آپ نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟"

"بلقیس شیخ" مجھے افسوس ہے ہڑتال کے درمیان ہم بالکل کچھ

نہیں کر سکتے۔ مگر اچانک اُس کی آنکھوں میں پہچان کی چمک جاگ اُٹھی۔ آپ وہی بلقیس شیخ ہیں جنہوں نے سادہ رہن سہن کا منصوبہ تیار کیا تھا۔

"جی! میں وہی ہوں"

جذباتی طور پر اُس نے میز پر ہاتھ مارا اور کہا "ٹھیک"

ایک کرسی کھینچتے ہوئے اُس نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میرا خیال ہے کہ وہ سب سے شاندار پروگرام تھا جو کبھی ہمارے ملک میں رائج ہوا۔ میں مُسکرائی۔ پھر وہ آفیسر پُر اعتماد انداز میں میز پر جُھکا اور کہنے لگا کہ بتائیں ہم آپ کے لئے کیا کر سکتے ہیں؟

اُس نے میرے مسئلہ کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ تین روز کے اندر مجھے کراچی سے امریکہ کے لئے جہاز لینا ہے۔ اُس آدمی کے چہرے پر دیکھنے سے لگتا تھا کہ وہ کچھ کرے گا۔ کھڑے ہوتے ہوئے اُس نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے کلرک کو بُلایا اور اُسے کہا کہ نئے اسسٹنٹ کو بلاؤ۔

بڑی دھیمی آواز میں وہ کہنے لگا کہ میرے پاس ایک عارضی سٹینوگرافر ہے وہ باقاعدہ اسٹاف کا رکن نہیں ہے اور ہڑتال پر نہیں ہے۔ وہ سرٹیفکیٹ ٹائپ کر دے گا۔ میں بذاتِ خود اُس پر مہر لگا دوں گا۔ مجھے مدد کرنے میں خوشی ہے۔

چند منٹ بعد مکمل سرٹیفکیٹ میرے ہاتھ میں تھا۔ جاتے وقت میں نے سرٹیفکیٹ کو ہلاتے ہوئے کلرک کو الوداع کہا۔ وہ بہت حیران ہوا۔ اور جب اُس نے میری مُسکراہٹ کو دیکھنے کے لئے میگزین سے اپنی نظریں ہٹائیں تو میں نے اُسے کہا "خُدا آپ کو

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

برکت دے"۔

چند منٹ کے بعد ہم گورنمنٹ کے آفس سے نکلے تو خالد حیران تھا۔ اور کہنے لگا کہ سارے معاملے کو طے کرنے میں صرف بیس منٹ لگے ہیں۔ وہ کہنے لگا کہ اگر سارے لوگ ڈیوٹی پر ہوتے تو اس سے زیادہ وقت لگتا۔

میرا دل نغمہ سرا تھا۔ میں نے خالد کو سمجھانے کی کوشش کی کہ خداوند ہماری رفاقت پسند کرتا ہے۔ جب ہم دُعا کرتے ہیں تو وہ ہمارے ساتھ کام کرنا چاہتا ہے۔ اس میں موسیٰ کے عصا کا اصول کارفرما تھا۔ اگر خود ایمان کا قدم اٹھائے بغیر میں معاملہ محض خداوند کے ہاتھ میں ہی دے دیتی تو مجھے شاید سرٹیفکیٹ نہ ملتا۔ جو کچھ میں کرسکتی تھی اُسے کرتے ہوئے مجھے قدم اُٹھانا تھا۔ مجھے کہنا تھا کہ میں انچارج کو ملنا چاہتی ہوں جس طرح خدا نے موسیٰ سے کہا کہ وہ چھڑی سے چٹان کو مارے۔ اِسی طرح وہ ہمیں بھی کہتا ہے کہ ہم معجزات کے وقوع میں خود بھی حصّہ لیں۔

میرے جذبات سے خالد کچھ حیران ہو گیا تھا اور مُسکراتے ہوئے کہنے لگا ممی! ایک بات میں ضرور کہوں گا۔ میں نے غور کیا ہے کہ شکریہ کی بجائے آپ ہمیشہ کہتی ہیں "خدا آپ کو برکت دے"، اور جب آپ یہ کہتی ہیں تو جو کچھ میں نے سُنا ہے یہ اِس سب سے خوبصورت لگتا ہے۔

اب جبکہ کاغذات مکمل تھے تو مجھے واہ میں عزیزوں کو الوداع کہنے کا خیال آیا۔ کیونکہ میں قائل ہو چکی تھی کہ یہ دورہ چار ماہ سے کہیں زیادہ ہوگا۔ تاہم جب میں نے اُس کا ذکر کیا تو خالد کہنے لگا

"کیا آپ نے سیلاب کے بارے میں نہیں سُنا؟"

زیر دست بارشوں کے سبب سے لاہور اور واہ کے درمیان سڑک کا ایک حصّہ کٹ گیا ہے۔ کئی مربع میل زمین سیلاب کے پانی میں ڈوبی پڑی تھی۔ آمدورفت کا سارا بندوبست درہم برہم ہے۔ میرا دل ڈوب گیا۔ مجھے الوداع کہنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ جس طرح لوط کو کہا گیا تھا کہ پیچھے مڑ کر نہ دیکھے۔ خداوند مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں پیچھے سب کچھ بھول جاؤں۔

پروگرام کے مطابق مجھے جمعہ کی صبح کو کراچی کے لئے روانہ ہونا تھا۔ میں بذریعہ ہوائی جہاز کراچی جاؤں گی جہاں سے میں امریکہ روانہ ہوں گی۔ بیگی اور اُس کا بیٹا نئی دہلی سے اپنے سفر کا آغاز کریں گے۔ اُن کا نیویارک جانے والا جہاز پین امریکن دہلی سے روانہ ہو کر کراچی رُکنا تھا۔ مجھے اور محمود کو اُن کے ساتھ سفر کرنا تھا۔

جمعرات کی صبح مجھے غیر معمولی سی تحریک ہوئی کہ میں انتظار نہ کروں۔ میری فکر کا مرکز محمود تھا۔ کسی نہ کسی طرح واہ میں یہ خبر پہنچ گئی تھی کہ ہم محض لاہور کے دورے پر ہی نہیں تھے بلکہ ملک سے باہر جانے کی تیاریوں میں تھے۔ کیا اِس بات کا امکان نہیں تھا کہ رشتہ دار اپنے نکتہ نظر سے میرے گھناؤنے اثر سے محمود کو بچانے کے لئے اُسے مجھ سے لے لیں۔ کیا مجھے کسی نہ کسی بہانہ سے روک لیا جائے گا؟ خطرے کا احساس بڑا قوی تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں انتظار نہیں کروں گی۔ میں جمعرات کو ہی چل دوں گی۔ میں کراچی میں جا کر عزیزوں کے ہمراہ رہوں گی۔

پس اُس بعد از دوپہر میں اور محمود جلدی جلدی اپنا سامان

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرأت کی

پیک کرکے اور خالد اور اُس کے خاندان کو الوداع کہہ کر ایئرپورٹ کی طرف چل دیئے۔ اطمینان کے ساتھ ہم نے لاہور کو خیرباد کہا اور اپنی منزل کی طرف چل دیئے۔

کراچی رنگا رنگ مناظر کا گہوارہ ہے۔ اِس قدر وسیع شہر میں کوئی ہمارا نشان نہیں پا سکتا تھا۔ میں دوستوں کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اور اگلے روز امریکہ کے لئے روانہ ہونے کے لئے شاپنگ کر رہی تھی۔ اچانک میں ایک زبردست دباؤ کے نیچے تھی۔ ایک دیوار کا سہارا لیتے ہوئے میں نے خداوند سے حفاظت کے لئے دُعا کی۔

مجھے تحریک ہوئی کہ میں اور محمود اِس رات ایک ہوٹل میں رہیں میں نے اِس خیال کو اپنے ذہن سے نکالنے کی کوشش کی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا احمقانہ خیال تھا۔ پھر مجھے مجوسیوں کا واقعہ یاد آیا کہ کس طرح اُنہیں خواب میں خبردار کیا گیا تھا کہ وہ دوسرے راستہ سے اپنے ملک روانہ ہو جائیں۔

لہٰذا جلد ہی ہم کراچی کے ایئرپورٹ پر ایئرفرانس ہوٹل میں تھے۔ جتنی جلدی ہو سکا میں محمود کو لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اور کاؤنٹر پر کہہ دیا کہ ہمارا کھانا کمرے ہی میں بھیج دیا جائے۔ ہم محض انتظار کی گھڑیاں گنتے رہے۔ محمود کچھ بے قرار دکھائی دیتا تھا۔ پوچھنے لگا کہ امی آپ کو اِس قدر چھپنے کی کیا ضرورت ہے؟

اُس رات روانگی سے پہلے میں بستر میں پڑی غور کرتی رہی کہ آخر میں اِس قدر محتاط کیوں ہوں؟ اِس کا کوئی خاص سبب نہ تھا کیا میں اپنے جذبات کو اپنے اُوپر قابو پانے کی اجازت دے رہی تھی؟ کیا ماضی کی دھمکیوں کے سبب سے میں بلاوجہ خوفزدہ تھی؟

مثلاً آگ کا واقعہ؟ میں خیالوں میں گُم محض چند گھنٹے سوئی تھی۔ صبح دو بجے میں جاگ اُٹھی اور تیار ہوگئی۔ پھر وہی جلدی کا خیال طاری تھا۔ یہ مجھے مضحکہ خیز سا لگا۔ یہ میری طبیعت کے خلاف تھا۔ میرے پاس اِسے بیان کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ میرے ہوٹل چھوڑنے کا وقت آ پہنچا تھا۔ اور خداوند مجھے جلدی کرنے کو کہہ رہا تھا۔ میں نے محمود کو کپڑے پہنائے سامان دروازہ میں رکھا اور قتلی کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔

صبح کے تین بجے تھے۔ روانگی پانچ بجے تھی۔ محمود میرے ساتھ کھڑا ٹیکسی کا انتظار کر رہا تھا جس پر ہم ٹرمینل کی جانب جانے والے تھے۔ اُس کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ میں نے چاند کی طرف نگاہ کی اور مجھے گمان ہوا کہ کیا یہ آخری وقت ہے۔ جب میں اپنے ہی وطن میں چاند کا نظارہ کروں گی؟

نسیم سحر قریبی باغ میں لگے ہوئے پھولوں سے معطر تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنا باغ پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گی۔

بالآخر ٹیکسی آگئی اور میں اور محمود اُس میں سوار ہو گئے۔ ٹریفک سے گزرتے وقت میں دُعا کرتی رہی اُس وقت بھی ایئرپورٹ پر لوگوں کا جم غفیر تھا۔ جونہی کار ٹریفک لائٹ کو پار کرتی ہوئی گزری میں بے قراری کے عالم میں سیٹ میں دھنس گئی۔ ہم قدرے خاموش تھے۔ میں نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ مجھے اِس وقت ڈرنے کی بجائے دُعا کرنے کی ضرورت ہے۔

میں نے دُعا کی اے خداوندا! یہ اعصابی بے قراری دور کر دے۔ اے خداوند یہ اعصابی بے قراری تیری طرف سے نہیں۔ میں ایک ہی

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

وقت میں تجھ پر بھروسہ اور فکر نہیں کر سکتی۔ اور تو بھی اگر یہ جلدی کرنے کی تحریک تیری طرف سے ہے تو یقیناً اس کے پیچھے کوئی سبب ہوگا۔ اور مجھے اس تحریک کو بجالانا چاہیئے۔

ہم ٹرمینل میں داخل ہوئے۔ بڑے بڑے جیٹ طیاروں کے انجنوں کے چلنے کی آواز آرہی تھی۔ اور ہر کوئی وقت کی نزاکت کے پیش نظر جلدی میں تھا۔ کافی شور شرابا تھا جب میں نے اپنے ملک کے جھنڈے کو ہوا میں لہراتے ہوئے دیکھا تو میں دل تھام کر رہ گئی۔ میں نے اقرار کیا کہ میں ہمیشہ اپنے جھنڈے کی، اپنے لوگوں کی اور اُن کے عقیدے کی عزت کروں گی۔ قلی ہمارا سامان کاؤنٹر پر لے آیا۔ ہر کام احسن طور پر انجام پایا۔

ہم دونوں کے پاس چالیس چالیس پونڈ وزن تھا۔ جب میں نے اپنے خاندان کے دوسرے دوروں پر غور کیا جو ہم ملک میں کرتے تھے تو مجھے ہنسی آگئی۔ کیونکہ محض چند روز کے قیام کی خاطر ہزاروں پونڈ وزن لے جایا جاتا تھا اور پھر بھی کبھی کبھی اپنے چند کپڑے ساتھ نہ لے جانے کی شکایت کرتی تھی۔

جہاز کے آنے تک ہمیں ایک گھنٹہ انتظار کرنا تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ لوگوں کی بھیڑ بھاڑ میں چھپ کر یہ وقت پاس کیا جائے اور ہمیں کوئی دیکھ نہ سکے۔ مگر میں انجانے خطرے کو اپنے ذہن سے نہ نکال سکی۔ پھر میں نے بلا وجہ فکر مند ہونے پر اپنے آپ کو کوسا۔ میں نے اپنے آپ کو یاد دلایا کہ خداوند حالات کا بھی خداوند ہے۔ وہ اس ماحول سے نکلنے میں میری رہنمائی فرما رہا ہے۔ اور مجھے صرف فرمانبرداری کرنے کی ضرورت ہے۔

محمود نے ٹائیلٹ جانے کو کہا۔ میں باہر اُس کا انتظار کرتی رہی۔ یکایک لاؤڈ اسپیکر نے ہماری فلائیٹ کا اعلان کیا۔ پین امریکن کی نیویارک کے لئے فلائٹ سواریوں کی منتظر ہے۔ میرا دل دہل گیا۔ محمود ابھی تک نہیں آیا تھا ہمیں جانا چاہیئے۔

اچانک ٹائیلٹ کا دروازہ کھُلا۔ محمود کی بجائے یہ کوئی اور تھا۔ میں دروازے کے قریب پہنچ گئی۔ میں کیا کر رہی تھی۔ یقیناً اسلامی ملک میں عورت کا آدمیوں کی ٹائیلٹ کے قریب جانا غیر واجب تھا۔ اگرچہ اُس میں نوبرس کے بچے کی تلاش ہی مقصود کیوں نہ ہو۔

ہماری فلائٹ کا دوبارہ اعلان ہو رہا تھا۔ نیویارک کے لئے پین امریکن کی فلائٹ روانگی کے لئے تیار ہے۔ سواریوں سے درخواست ہے کہ جہاز کے قریب پہنچ جائیں۔

میرا دل بُری طرح بے قرار تھا۔ میں نے ٹائیلٹ کے دروازے کو دھکیلتے ہوئے محمود کو آواز دی۔

ایک ننھی سی آواز سے جواب دیا "ممی! میں آرہا ہوں"۔

میں نے ایک لمبا سانس لیا اور دیوار کی ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ جلد ہی محمود باہر آگیا۔ میں نے چلاّتے ہوئے کہا تو کہاں تھا؟ کس چیز نے تجھے روکے رکھا۔

بہرصورت میں نے جواب کا انتظار نہ کیا اور محمود کا ہاتھ تھامے ہوئے دوڑی۔ ہم طویل ہال سے جہاز پہ چڑھنے والے گیٹ کی طرف دوڑتے ہوئے گئے۔ ہم جہاز پہ چڑھنے والی آخری سواریوں میں سے تھے۔

محمود حیرانگی سے بولا ممی! کتنا بڑا جہاز ہے؟

میں نے اُسے باپ کہنے کی جرارت کی

یہ ۷۴۷ کا جہاز کافی بڑا تھا۔ ہم دونوں بہت خوش تھے۔ میں نے اتنا بڑا جہاز پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اُوپر چڑھنے سے پہلے میں ایک لمحہ کے لئے جھکی یہ میرا آخری قدم تھا اپنی دھرتی پر۔

جہاز کا اندرونی حصہ ایک بہت بڑا آڈیٹوریم کی طرح لگتا تھا۔ ایک ایئر ہوسٹس نے سیٹ کی طرف ہماری رہنمائی کی۔ بیگی کہاں تھی؟ اُس کے بغیر میں امریکہ میں کیا کروں گی؟

اور پھر ہم نے اُسے دیکھ لیا۔ وہ ہماری طرف آرہی تھی۔ بیگی مجھے گلے ملی۔

چلاّتے ہوئے کہنے لگی میری عزیزہ میں آپ کے بارے میں بہت فکرمند تھی۔ میں بورڈنگ گیٹ پر آپ کو نہ دیکھ سکی تھی۔ میں نے بیان کیا کہ کیا ہوا تھا۔ بیگی نے سُکھ کا سانس لیا۔ اُس نے ہمارا تعارف اپنے بیٹے سے کرایا جو اُس کے ہمراہ تھا۔ کتنی بُری بات تھی کہ ہم اکٹھے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ وہ کہنے لگی کہ جو سیٹیں وہ ہمیں دیں ہمیں اُنہی پر بیٹھنا ہے۔

سچ تو یہ تھا کہ میں خود اور کسی گفتگو میں دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ میرے خیالات کا مرکز یہ تھا کہ میں اپنے وطن کو چھوڑ کر جا رہی ہوں یقیناً میں غمزدہ تھی۔ مگر اِس کے ساتھ ہی میں سمجھتی تھی کہ میں ٹھیک اقدام کر رہی ہوں۔ میری سمجھ سے معاملہ باہر تھا۔

بہت جلد محمود اپنا رنگ دکھانے لگا۔ وہ ایک ایئر ہوسٹس سے گھل مل گیا۔

وہ بہت خوش تھا۔ میں نے کھڑکی میں سے دُور اُفق میں سورج کے طلوع ہونے کا منظر دیکھا۔ انجن کی آواز بڑھ گئی

اور ایک جذباتی سی لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ ہمارا جہاز رن وے پر تھا۔ میں نے پیچھے دیکھا۔ مگر پیگی کو نہ دیکھ سکی۔ محمود میرے ساتھ والی سیٹ پر تھا۔ اُڑنے سے پہلے انجن کی گرج کی سی آواز سے اُس کا چہرہ چمک گیا۔ میں نے محمود کا ہاتھ پکڑ کر دُعا کرنا شروع کر دی۔

خداوندا اب کیا ہوگا؟ پھر مجھے اپنی آرزوؤں کی تکمیل کا احساس ہُوا۔ مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ اِس کے بعد کیا ہوگا۔ میں مطمئن تھی۔ کیونکہ میرا خداوند میرے ساتھ تھا۔ اب مجھے اعصابی پریشانی نہیں ستاتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ بہرحال میں نے خداوند کی فرمانبرداری کی ہے۔ اور میں تسلیم کروں گی کہ میں نہیں جانتی کہ حقیقت میں کیا ہوتا؟ اگر میں اُس کا ہر حکم بجا نہ لاتی۔ اور اِس طرح اقدام نہ کرتی جیسے میں نے کیا تھا۔

کھڑکیوں میں سے آتی ہوئی مدھم روشنی غائب ہوگئی۔ اور یکایک جہاز کے انجن کی آواز بلند ہوگئی۔ ہم ہوا کے بازوؤں پر تھے۔ میں اپنے نیچے بحرِ ہند کو دیکھ سکتی تھی۔ جو پاکستان سے ملتا تھا۔

میں نے خداوند کی دُعا میں اپنے ہاتھ اُٹھائے۔ فقط وہی میری پناہ تھا۔ اُس کی حضوری میں رہنا ہی بس میری خوشی تھی۔ میری خوشنودی اُس کی حضوری میں رہنے سے تھی۔ اُس کی حضوری میں جلال ہی جلال ہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

خداوند میں تیرا شکر کرتی ہوں کہ تو
سفر میں میرے ہمراہ ہے۔

بیسویں صدی کی یہ سچّی داستان ہر اُس فردِ بشر کے لئے ہے جو کُلی طور پر اپنے آپ کو اپنے خالق کے ہاتھ میں سونپنے کے کرشمے دیکھنے کا متمنّی ہو۔ اور جسے یہ گمان ہو کہ کیا قادرِ مطلق واقعی اپنی مخلوق سے کئے ہوئے وعدوں کے بموجب اُن کی ہر طرح سے اور ہر حالت میں حفاظت کرنے پر قادر ہے؟

یہ سرزمینِ پاکستان کے معزز گھرانے کی خاتون "بیگم بلقیس شیخ" کی حقیقی کہانی ہے کہ کیونکر زندگی کے چوراہوں پر اُسے اِن سوالات کا جواب میسّر ہوا جو اُسے درپیش تھے۔

جب اُس کے خاوند نے جو کہ حکومت میں ایک ممتاز عہدہ پر فائز تھے اُسے چھوڑ دیا تو وہ اپنی موروثی جاگیر پر تعیشات سے بھرپور زندگی میں سُکون تلاش کرنے لگی۔ مگر اُسے باطنی سکون میسّر نہ ہوا۔ قرآن مجید میں تحقیق سے اُسے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام سے متعلق کچھ حوالہ جات ملے۔ تجسّس کی خاطر وہ اِنجیل کی طرف رُجوع ہوئی۔ تب سلسلہ وار سپنوں کے رُوپ میں اُس کی زندگی میں معجزانہ طور پر انقلاب برپا ہُوا۔

896 3513

Published by C.L.C. Asian Books (U.K.)

Printed in Sri Lanka by New Life Literature (Pvt) Ltd.